شمارہ نمبر 19 ، جمادی اولیٰ، ۱۴۳۱ھ، مئی 2010

حسین بن منصور الحلاّج	غلام مصطفیٰ ظہیر امن پوری	2
قارئین کے سوالات	غلام مصطفیٰ ظہیر امن پوری	16
بچے کو دودھ چھڑانے کی مدت	غلام مصطفیٰ ظہیر امن پوری	21
صحیح بخاری کا مطالعہ اور فتنۂ انکارِ حدیث	حافظ ابو یحییٰ نور پوری	34
اللہ کہاں ہے؟	غلام مصطفیٰ ظہیر امن پوری	47

حسین بن منصور الحلاّج

غلام مصطفیٰ ظہیر امن پوری

مشہور گمراہ صوفی حسین بن منصور حلاج (م ۳۰۹ھ) زندیق اور حلولی تھا۔اس کے کفر و الحاد پر علمائے حق کا اجماع و اتفاق ہے۔اس کا بنیادی عقیدہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز میں حلول کر گئے ہیں۔یہ عقیدۂ وحدۃ الوجود کا بانی تھا۔اس کے کفر و الحاد کی وجہ سے علماء نے اس کا خون جائز قرار دیا تھا اور اسے قتل کر دیا گیا تھا۔

ائمہ اہل سنت میں سے کوئی بھی اسے اچھا نہیں سمجھتا تھا، البتہ گمراہ صوفی اس کے پکے حمایتی ہیں، اس کے باوجود وہ اپنے تئیں اہل سنت کہتے نہیں تھکتے۔

حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ (۷۷۳۔۸۵۲ھ) اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

ولا أری یتعصّب للحلاّج إلّا من قال بقوله الّذی ذکر أنّه عیّن الجمع ، فھذا ھو قول أھل الوحدۃ المطلقۃ ، ولھذا تری ابن عربیّ صاحب " الفصوص " یعظّمه ویقع فی الجنید ... ''میں حلاج کے حق میں اسی شخص کو تعصب رکھتے دیکھتا ہوں، جو اسی کے قول کا قائل ہے، جو اس سے ذکر کیا گیا ہے کہ اس نے (خالق و مخلوق کے درمیان) جمع کو لازم کیا تھا۔یہی وحدتِ مطلقہ (وحدت الوجود) والوں کا عقیدہ ہے۔اسی لیے آپ **الفصوص** نامی کتاب کے مصنف ابنِ عربی کو دیکھیں گے کہ وہ اس کی تعظیم کرتا ہے اور جنید کی گستاخی کرتا ہے۔۔۔''

(لسان المیزان لابن حجر : ۳۱۵/۲)

حافظ ابن الجوزی رحمہ اللہ (۵۰۸۔۵۹۷ھ) لکھتے ہیں: **اتّفق علماء العصر علٰی إباحۃ دم الحلاّج .** ''اس کے زمانہ کے تمام علمائے کرام حلاج کے خون کے مباح ہونے پر متفق ہو گئے تھے۔'' (تلبیس ابلیس لابن الجوزی : ۱۵٤/۱)

حافظ ابنِ کثیر رحمہ اللہ (۷۰۱۔۷۷۴ھ) لکھتے ہیں: **وقد اتّفق علماء بغداد علی کفر الحلاّج وزندقته ، وأجمعوا علی قتله وصلبه ، وکان علماء بغداد إذ ذاک ھم علماء الدّنیا .**

''بغداد کے علمائے کرام حلاج کے کافر وزندیق ہونے پر متفق ہو گئے تھے اور انہوں نے اسے قتل کرنے اور سولی پر لٹکانے پر اجماع کر لیا تھا اور اس زمانے میں علمائے بغداد ہی دنیا کے (کبار) علماء شمار ہوتے تھے۔'' (البداية والنهاية لابن كثير : ١٤٩/١١)

ابوحامد علامہ غزالی (م۵۰۵ھ) لکھتے ہیں: **وأمّا الشّطح فنعني به صنفين من الكلام أحدثه بعض الصّوفية ، أحدهما الدّعاوى الطّويلة العريضة فى العشق مع اللّٰه تعالىٰ والوصال المغنى عن الأعمال الظّاهرة حتّى ينتهى قوم إلى دعوى الاتّحاد وارتفاع الحجاب والمشاهدة بالرّؤية والمشافهة بالخطاب ، فيقولون : قيل لنا كذا وقلنا كذا ، ويتشبّهون فيه بالحسين بن منصور الحلّاج الّذى صلب لأجل إطلاقه كلمات من هذا الجنس ، ويستشهدون بقوله : أنا الحقّ ، وبما حكى عن أبي يزيد البسطاميّ أنّه قال : سبحاني ، سبحاني ، وهذا فنّ من الكلام عظيم ضرره فى العوّام حتّى ترك جماعة من أهل الفلاحة فلاحتهم وأظهروا مثل هذه الدّعاوى ، فإنّ هذا الكلام يستلذّه الطّبع إذ فيه فيه البطالة من الأعمال مع تزكية النّفس بدرك المقامات والأحوال ، فلا تعجز الأغنياء عن دعوى ذلك لأنفسهم ولا عن تلقف كلمات مخبطة مزخرفة ، ومهما أنكر عليهم ذلك لم يعجزوا عن أن يقولوا هذا إنكار مصدره العلم والجدال ، والعلم حجاب ، والجدل عمل النّفس ، وهذا الحديث لا يلوح إلّا من الباطن بمكاشفة نور الحقّ ، فهذا ومثله ممّا قد استطار فى البلاد شرره وعظم فى العوّام ضرره ، حتّى نطق بشىء منه ، فقتله أفضل فى دين اللّٰه من إحياء عشرة ...**

''شطح سے مراد ہم دو طرح کا علم کلام لیتے ہیں، جسے بعض صوفیوں نے گھڑا ہے۔ ان میں سے ایک تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ عشق اور اس وصال کے بلند بانگ دعوے ہیں، جو ظاہری اعمال (نماز، روزہ، حج وغیرہ) سے مستغنی کر دیتا ہے، حتی کہ کئی لوگ اتحاد (وحدت الوجود)، (خالق ومخلوق کے درمیان) پردے اٹھ جانے، اللہ تعالیٰ کے مشاہدے اور بلاواسطہ کلام کے دعاوی تک پہنچ گئے ہیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) یوں کہا گیا اور ہم نے یوں کہا۔ اس بارے میں وہ حسین بن منصور حلاج سے مشابہت اختیار کرتے ہیں، جسے اس

جیسی باتیں کرنے کی وجہ سے صولی پر لٹکا دیا گیا تھا اور وہ دلیل میں اسی منصور کا **أَنَا الْحَقُّ** (میں ہی اللہ ہوں) والا قول پیش کرتے ہیں، اسی طرح ابو یزید بسطامی کا وہ قول بھی اپنی دلیل بناتے ہیں کہ اس نے کہا، **سُبحانی ، سُبحانی** (میں پاک ہوں، میں پاک ہوں)۔ علم کلام کی جو یہ قسم ہے، لوگوں میں اس کا نقصان بہت زیادہ ہوگیا ہے، یہاں تک کہ فلاح کی راہ پر چلنے والے لوگوں کی ایک بڑی جماعت نے اپنی راہِ فلاح چھوڑ دی اور اس طرح کے دعاوی شروع کردیئے، وجہ یہ ہے کہ علم کلام کی اس قسم کو طبیعت بہت پسند کرتی ہے، کیونکہ اس میں اعمال کو چھوڑنے کے باوجود مقامات واحوال کے ساتھ تزکیہ نفس (کا دعویٰ) موجود ہے۔ بد دماغ لوگوں کو اپنے لیے اس طرح کے دعاوی کرنے سے اور بے وقوفی پر مبنی چکنے چپڑے کلمات کہنے سے آپ نہیں روک سکتے۔ جب بھی ان پر اس بات کا اعتراض کیا گیا تو وہ یہ کہنے سے باز نہیں آئے کہ اس انکار کا مبدا علم وجدال ہے، علم پردہ ہے اور جدال عمل نفس ہے اور یہ باتیں اللہ تعالیٰ کے نور کے مکاشفہ کے ذریعے باطن سے نکلتی ہیں۔

یہ اور اس طرح کی دیگر خرافات کا شر علاقوں میں پھیل گیا ہے اور عوام میں ان کا نقصان بہت بڑھ گیا ہے، یہاں تک کہ جو شخص اس طرح کی بکواس بکے، اسے قتل کرنا دینِ اسلام میں دَس لوگوں کی زندگی بچانے سے بہتر ہے۔۔۔'' (احیاء العلوم للغزالی : ۳٦/۱)

نیز لکھتے ہیں: **ومن هنا نشأ خيال من ادّعى الحلول والاتّحاد وقال : أنا الحقّ ، وحوله يدندن كلام النّصارى في دعوى اتّحاد اللّاهوت والنّاسوت أو تدرّعها بها أو حلولها فيها على ما اختلف فيهم عبارتهم ، وهو غلط محض ...**

''یہاں سے اس شخص کا خیال پیدا ہوا ہے، جو حلول واتحاد کا دعویٰ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں ہی اللہ ہوں۔ لاہوت کے ناسوت میں متحد ہو جانے یا اس میں چھپ جانے یا اس میں حلول کر جانے کے بارے میں نصاریٰ کی کلام بھی اسی کے لگ بھگ ہے، اگرچہ اس بارے میں ان کی عبارات مختلف ہیں۔ یہ عقیدہ بالکل غلط ہے۔۔۔'' (احیاء علوم الدین للغزالی : ۲۹۲/۲)

علامہ ذہبی رحمہ اللہ (۶۷۳۔۷۴۸ھ) لکھتے ہیں: **فتدبّر يا عبد اللّه ! نحلة الحلّاج الّذى هو من رؤوس القرامطة ، ودعاة الزندقة ، وأنصف ، وتورّع ، واتّق ذلك ، وحاسب نفسك ، فإن تبرهن لك أنّ شمائل هذا المرء شمائل عدوّ**

للإسلام ، محبّ للرّئاسة ، حريص على الظّهور بباطل وبحقّ ، فتبرّأ من نحلته ، وإن تبرهن لك ـ والعياذ بالله ـ أنّه كان ـ والحالة هذه ـ محقّا ، هاديا ، مهديّا ، فجدّد إسلامك ، واستغث بربّك أن يوفّقك للحقّ ، وأن يثبّت قلبك على دينه ، فإنّما الهدى نور يقذفه الله فی قلب عبده المسلم ، ولا قوّة إلّا بالله ...

''اے اللہ کے بندے ! آپ اس حلّاج کے مذہب پر غور کریں ، جو کہ کہ قرامطہ(غالی اور خطرناک قسم کے رافضی لوگوں) کا ایک سردار اور الحادو بے دینی کا زبردست داعی تھا۔ آپ انصاف وغیر جانبداری سے کام لیں ،اس سے بچ جائیں اور اپنے نفس کا محاسبہ کریں۔اگر آپ کے لیے واضح ہو جائے کہ اس شخص کے خصائل اسلام دشمن ،حکومت پسند اور باطل وحق کے اختلاط کے ساتھ غلبہ حاصل کرنے کے خواہش مند شخص کے خصائل ہیں تو فوراً اس کے مذہب سے دستبردار ہو جایئے !اور اللہ نہ کرے،اگر اس صورتِ حال کے باوجود آپ کو وہ حق بجانب ،ہدایت یافتہ اور ہدایت کنندہ نظر آئے تو اپنے اسلام کی تجدید کیجیے اور اپنے ربّ سے مدد مانگیے کہ وہ آپ کو حق کی توفیق دے اور آپ کے دل کو اپنے دین پر ثابت رکھے، کیونکہ ہدایت تو ایک نور ہے، جسے اللہ تعالیٰ اپنے مسلمان بندے کے دل میں جاگزیں کر دیتا ہے۔گمراہی سے بچنے اور حق کو پانے کی قوت وطاقت صرف اللہ تعالیٰ دیتا ہے۔۔۔''

(سیر اعلام النبلاء للذہبی : ١٤/٣٤٥)

اس کے باوجود حلاج کی طرف منسوب قول **أنا الحقّ** (میں ہی اللہ ہوں) کے دفاع میں دیوبندیوں کے''حکیم الامت''جناب اشرف علی تھانوی لکھتے ہیں :

''جیسے شجرۂ طور بلا اختیار کلمہ **إِنِّیْ أَنَا اللّٰهُ** کا مظہر تصرفِ حق سے ہوگیا،اسی طرح منصور بھی بلا اختیار کلمہ **أنا الحقّ** کا مظہر تصرفِ حق سے ہوگیا۔'' (بوادر النوادر از تھانوی : ٣٩٨)

نیز لکھتے ہیں : ''دوسرے معنیٰ محتمل یہ ہے کہ کہ میں نے یہ راز ظاہر نہیں کیا،خود محبوب ہی نے ظاہر کیا،یعنی **أنا الحقّ** کے ساتھ وہی متکلم ہیں،جیسا شجرۂ طور سے کلامِ حق **إِنِّیْ أَنَا اللّٰهُ** کا ظہور ہوا۔''(اشعار الغیور بما فی اشعار ابن منصور از تھانوی : ١٤٣)

مزید لکھتے ہیں : ''اسی ظہور کے ایک درجہ کو تجلی بھی کہتے ہیں،جیسے شجرۂ طور میں بھی تجلی تھی۔ اگر کسی انسانِ کامل میں کلام کی تجلی ہو جائے تو بُعد کیا ہے؟''(ایضًا : ١٤٧)

جناب ظفر احمد تھانوی دیوبندی صاحب لکھتے ہیں: ''اور ایک تاویل یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اس وقت ابنِ منصور کی زبان کلامِ حق کی ترجمان تھی۔ان کی زبان سے اسی طرح أنا الحقّ نکلا تھا، جیسا کہ شجرۂ موسیٰ سے إِنِّیٓ أَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعَالَمِیْنَ کی آواز آئی تھی ۔ ظاہر ہے کہ درخت نے اپنے کو اللہ رب العالمین نہیں کہا تھا، بلکہ اس وقت وہ کلامِ الٰہی کا ترجمان تھا۔اسی طرح ابنِ منصور کے متعلق بھی خیال کیا جا سکتا ہے اور غلبۂ حالات وواردات میں بارہا ایسا ہوتا ہے کہ عارف کی زبان سے اللہ تعالیٰ تکلم فرماتے ہیں، جس کو سالکین اصحابِ حال سمجھ سکتے ہیں۔پس یہ تو مسلم ہوسکتا ہے کہ ابنِ منصور کی زبان سے أنا الحقّ نکلا ہو، مگر یہ مسلم نہیں کہ ابنِ منصور نے خود أنا الحقّ کہا تھا۔''(سیرت منصور حلاج از ظفر احمد تھانوی : ۵۰)

تبصرہ : یہ انتہائی گمراہ کن اور کفریہ عقیدہ ہے، جو متکلمین کی باطل تاویلات کا نتیجہ ہے۔اہل سنت میں سے کوئی بھی اس کا قائل نہیں ہے۔اس سے واضح طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ تھانوی صاحب اور ان کے اذناب واحباب پکے عقیدۂ حلول کے قائل تھے، جو کہ کفرِ محض ہے۔یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی صریح گستاخی ہے اور سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی بھی گستاخی ہے، نیز ان کی جہالت کا منہ بولتا ثبوت ہے، قرآنِ مقدس کی توہین ہے اور خالص معنوی تحریف ہے۔ائمہ اہل سنت نے سختی سے اس کا ردّ کیا ہے، جیسا کہ:

① امام ابوالحسن الاشعری رحمہ اللہ (م۳۲۴ھ) لکھتے ہیں: **وزعمت الجهميّة كما زعمت النّصارى أنّ كلمة اللّٰه تعالٰى حواها بطن مريم رضى اللّٰه عنها وزادت الجهميّة عليهم ، فزعمت أنّ كلام اللّٰه مخلوق حلّ فى شجرة ، وكانت الشّجرة حاوية له ، فلزمهم أن تكون الشّجرة بذلك الكلام متكلّمة ، ووجب عليهم أنّ مخلوقا من المخلوقين كلّم موسىٰ صلّى اللّٰه عليه وسلّم ، وأنّ الشّجرة قالت : يا موسٰى إنّى أنا اللّٰه لا إله إلّا أنا فاعبدنى ، فلو كان كلام اللّٰه مخلوقا فى شجرة لكان المخلوق قال : يا موسٰى إنّى أنا اللّٰه أنا فاعبدنى ، وقد قال تعالىٰ : ﴿وَلٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّیْ لَأَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِيْنَ﴾ ، وكلام اللّٰه من اللّٰه تعالىٰ ، فلا يجوز أن يكون كلامه الّذى هو منه مخلوقا فى شجرة مخلوقة ، كما**

لا یجوز أن یکون علمه الّذی هو منه مخلوقا فی غیره ، تعالیٰ اللّٰه عن ذلک علوّا کبیرًا .

''نصاریٰ کی طرح جہمی لوگوں نے بھی خیال کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کلمہ کو مریم علیہا السلام نے اپنے پیٹ میں سمولیا تھا، جہمی لوگوں نے اس سے بڑھ کر یہ بھی کہا کہ اللہ تعالیٰ کی کلام مخلوق تھی، جو کہ ایک درخت میں داخل ہوگئی تھی اور اس درخت نے اس کلام کو اپنے اندر سمولیا تھا۔ اس طرح جہمی لوگوں پر یہ کہنا لازم آتا ہے کہ درخت ہی اس کلام کے ساتھ متکلم تھا اور سیدنا موسیٰ علیہ السلام سے ایک مخلوق نے ہی کلام کی تھی اور درخت ہی نے کہا تھا کہ اے موسیٰ میں ہی الٰہ ہوں، میرے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے، چنانچہ میری ہی عبادت کرو۔۔۔

اگر یہ اللہ تعالیٰ کی کلام درخت میں پیدا کردی گئی تھی تو پھر مخلوق نے ہی موسیٰ علیہ السلام سے یہ کہا تھا، حالانکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ **وَلٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّیْ لَأَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِيْنَ** ﴾ (لیکن میری بات ثابت ہوگئی ہے کہ میں جہنم کو انسانوں اور جنوں سے بھر دوں گا)، کلام اللہ، اللہ تعالیٰ ہی سے ہے، چنانچہ یہ کہنا جائز نہیں کہ وہ کلام جو اللہ کی طرف سے تھی، وہ ایک مخلوق درخت میں پیدا کردی گئی تھی، جیسا کہ یہ کہنا جائز نہیں کہ اللہ تعالیٰ کا وہ علم، جو اسی سے ہے، وہ کسی غیر میں پیدا کردیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان خرافات سے بہت بلند ہے۔''

(الابانة عن اصول الديانة لابى الحسن الاشعرى : ص ٦٨)

نیز لکھتے ہیں: **وقد قال اللّٰه تعالیٰ : ﴿ وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلِ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِإِذْنِهٖ مَا يَشَاءُ ﴾ ، فلو کان کلام اللّٰه لا یوجد إلّا مخلوقا فی شیء مخلوق لم یکن لاشتراط هذه الوجوه معنی ، لأنّ الکلام قد سمعه جمیع الخلق ووجدوه ــ بزعم الجهمیّة ــ مخلوقا فی غیر اللّٰه تعالیٰ ، وهذا یوجب إسقاط مرتبة النّبیّین صلوات اللّٰه علیهم أجمعین .**

ویجب علیهم إذا زعموا أنّ کلام اللّٰه لموسیٰ خلقه فی شجرة أن یکون من سمع کلام اللّٰه عزّ وجلّ من ملک أو من نبیّ أتی به من عند اللّٰه أفضل مرتبة من سماع الکلام من موسیٰ ، لأنّهم سمعوه من نبیّ ، ولم یسمعه موسیٰ من اللّٰه عزّ

وجلّ ، وإنّما سمعه من شجرة ، وأن يزعموا أنّ اليهودى إذا سمع كلام اللّٰه من النّبىّ عليه الصّلاة والسّلام أفضل مرتبة فى هذا المعنى من موسىٰ صلّى اللّٰه عليه وسلّم ، لأنّ اليهودىّ سمعه من نبىّ من أنبياء اللّٰه ، وموسىٰ سمعه مخلوقا فى شجرة ، ولو كان مخلوقا فى شجرة لم يكن مكلّما لموسىٰ من وراء حجاب ، لأنّ من حضر الشّجرة من الجنّ والإنس قد سمعوا الكلام من ذلك المكان ، وكان سبيل موسىٰ غيره فى ذلك سواء فى أنّه ليس كلام اللّٰه له من وراء حجاب .

ثمّ يقال لهم : إذا زعمتم أنّ معنى أنّ اللّٰه عزّ وجلّ كلّم موسىٰ : أنّه خلق كلاما كلّمه به فى الشّجرة ، وقد خلق اللّٰه عندكم فى الذّراع كلاما ، لأنّ الذّراع قالت لرسول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلّم : لا تأكلنى ، فإنّى مسمومة ، فيلزمكم أنّ ذلك الكلام الّذى سمعه النّبىّ صلّى اللّٰه عليه وسلّم كلام اللّٰه تعالىٰ ، فإن استحال أن يكون اللّٰه تكلّم بذلك الكلام المخلوق فما أنكرتم من أنّه يستحيل أن يخلق اللّٰه عزّ وجلّ كلامه فى شجرة ، لأنّ الكلام مخلوق ، لا يكون كلاما للّٰه ، فإن كان كلام اللّٰه وكان معنى أنّ اللّٰه تكلّم عندكم أنّه خلق الكلام ، فيلزمكم أن يكون اللّٰه متكلّما بالكلام الّذى خلقه فى الذّراع ، فإن أجابوا إلى ذلك ، قيل لهم : فاللّٰه تعالىٰ على قولكم هو القائل : لا تأكلنى ، فإنّى مسمومة ، تعالى اللّٰه عن قولكم وافترائكم عليه علوّا كبيرًا .

''اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:﴿ وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللّٰهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِإِذْنِهٖ مَا يَشَاءُ ﴾ (اور کسی بشر کے لیے ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے کلام کرے، مگر وحی کے ذریعے یا پردے کے پیچھے سے یا وہ کوئی رسول بھیج دے، پھر اس کی طرف اپنے اذن سے جو چاہے وحی کرے)، اگر اللہ تعالیٰ کی کلام کسی مخلوق میں ہی پیدا کی ہوئی پائی جاتی تو ان قیوط کے ساتھ مشروط کرنے کا کوئی معنیٰ نہیں، کیونکہ جہمی لوگوں کے بقول اسے بسا اوقات ساری مخلوقات اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور ذات میں پیدا شدہ حالت میں سن لیتی ہیں۔ یہ عقیدہ انبیائے کرام کا مقام ومرتبہ کم کرنے کا موجب بنتا ہے۔

جب وہ جہمی لوگ یہ دعویٰ کریں کہ اللہ تعالیٰ نے جو سیدنا موسیٰ علیہ السلام سے کلام کی تھی، اسے ایک درخت میں پیدا کیا تھا، اس وقت ان پر یہ لازم آتا ہے کہ جن لوگوں نے اس کلام کو کسی فرشتے یا ایلچی سے سنا ہو، جو اسے اللہ کے پاس سے لے کر آیا تھا، وہ کلام سننے کے اعتبار سے سیدنا موسیٰ علیہ السلام سے افضل ہوں، کیونکہ ان لوگوں نے اسے کسی نبی سے سنا ہوگا، لیکن موسیٰ علیہ السلام نے اسے اللہ عزوجل سے نہیں سنا، بلکہ ایک درخت سے سنا تھا، نیز ان جہمی لوگوں پر یہ بھی لازم آتا ہے کہ وہ یہ دعویٰ کر دیں کہ ایک یہودی جب اللہ تعالیٰ کی کلام کو اپنے نبی علیہ السلام سے سنے تو وہ اس کام میں موسیٰ علیہ السلام سے افضل ہوگا، کیونکہ یہودی نے اسے اللہ کی کسی نبی سے سنا ہوگا اور موسیٰ علیہ السلام نے اسے ایک درخت میں مخلوق ہونے کی صورت میں سنا ہوگا۔ اگر اللہ کی کلام درخت میں پیدا کر دی گئی تھی تو اللہ تعالیٰ نے پھر موسیٰ علیہ السلام سے پردے کے پیچھے سے کلام نہیں کی، کیونکہ جو بھی جن یا انسان اس جگہ حاضر ہوگا، اس نے اسی جگہ سے کلام کو سنا ہوگا۔ یوں موسیٰ علیہ السلام اور ان کے غیر کا ذریعہ ایک ہی ہوگا کہ انہوں نے کلام کو پردے کے پیچھے سے نہیں سنا۔

پھر ان جہمی لوگوں سے کہا جائے گا کہ جب تمہارا یہ دعویٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے موسیٰ علیہ السلام سے کلام کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس نے کلام کو درخت میں پیدا کیا، پھر اس کے ذریعے موسیٰ علیہ السلام سے کلام کی تو پھر اللہ تعالیٰ نے شانے کے گوشت میں بھی کلام پیدا کی ہے، کیونکہ شانے کے گوشت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا کہ مجھے نہ کھائیں، کیونکہ میں زہر آلودہ ہوں۔ چنانچہ تمہارے نزدیک یہ لازم آئے گا کہ جو کلام نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سنی تھی، وہ اللہ تعالیٰ کی کلام تھی۔۔۔" (الابانۃ للاشعری: ص ۱۰۹)

② امام آجری رحمہ اللہ (م۳۶۰ھ) لکھتے ہیں: **فإن قال قائل منهم : خلق اللّٰه عزّ وجلّ كلاما في شجرة ، وكلّم به موسىٰ ، قيل : هذا هو الكفر ، لأنّه يزعم أنّ الكلام مخلوق ، تعالى اللّٰه عزّ وجلّ عن ذلک ، ويزعم أنّ مخلوقا يدّعي الرّبوبيّة ، وهذا من أقبح القول وأسمجه ، وقيل له : يا ملحد ! هل يجوز لغير اللّٰه أن يقول : إنّني أنا اللّٰه ؟ نعوذ باللّٰه أن يقول قائل هذا مسلما ، هذا كافر ، يستتاب ، فإن تاب ورجع عن مذهبه السّوء وإلّا قتله الإمام ، فإن لم يقتله الإمام ولم يستتبه وعلم منه أنّ هذا مذهبه هجر ، ولم يكلّم ، ولم يسلّم عليه ، ولم يصلّ خلفه ، ولم تقبل شهادته ،**

ولم يزوّجه المسلم كريمته ... ''اگر ان جہمیوں میں سے کوئی کہے کہ اللہ تعالیٰ نے درخت میں کلام کو پیدا کیا تھا اور اس کے ذریعے موسیٰ علیہ السلام سے کلام کی تھی تو اسے کہا جائے گا، یہی کفر ہے، کیونکہ ان کا دعویٰ ہے کہ کلامِ الٰہی مخلوق ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہے۔ وہ شخص یہ گمان کرتا ہے کہ مخلوق ربوبیت کا دعویٰ کر رہی ہے۔ یہ سب سے قبیح اور بدترین قول ہے، اس سے مزید کہا جائے گا، اے ملحد و بے دین شخص! کیا غیر اللہ کے لیے یہ کہنا جائز ہے کہ میں ہی اللہ ہوں؟ ہم اللہ کی پناہ میں آتے ہیں کہ ایسا کہنے والا مسلمان ہو! یہ تو کافر ہے، اس سے توبہ کروائی جائے گی، اگر وہ توبہ کر لے اور اپنے برے مذہب سے لوٹ آئے تو ٹھیک ورنہ حاکمِ وقت اسے قتل کر دے۔ اگر وقت کا حکمران اسے قتل نہیں کرتا اور اس سے توبہ نہیں کروائی جاتی اور اس کا مذہب معلوم ہو جاتا ہے تو اسے چھوڑ دیا جائے گا، اس سے کلام نہیں کی جائے گی، اس پر سلام بھی نہیں کہا جائے گا، نہ ہی اسے کی اقتدا میں نماز پڑھی جائے گی، نہ ہی اس کی گواہی قبول کی جائے گی، نہ ہی اس سے کوئی مسلمان اپنی بیٹی کی شادی کرے گا۔''

(الشريعة للآجری: ۳۱۳)

③ حافظ بیہقی رحمہ اللہ (م ۴۵۸ھ) لکھتے ہیں: فلو كان كلام اللّٰه لا يوجد إلّا مخلوقا فى شيء مخلوق لم يكن لاشتراط هذه الوجوه معنى ، لاستواء جميع الخلق فى سماعه من غير اللّٰه ووجودهم ذلک عند الجهميّة مخلوقا فى غير اللّٰه ، وهذا يوجب إسقاط مرتبة النّبيّين صلوات اللّٰه عليهم أجمعين ، ويجب عليهم إذا زعموا أنّ كلام اللّٰه لموسىٰ خلقه فى شجرة ، أن يكون من سمع كلام اللّٰه من ملک أو من نبىّ أتاه به من عند اللّٰه أفضل مرتبة فى سماع الكلام من موسىٰ ، لأنّهم سمعوه من نبىّ ، ولم يسمعه موسىٰ عليه السّلام من اللّٰه ، وإنّما سمعه من شجرة ، وأن يزعموا أنّ اليهود إذ سمعت كلام اللّٰه من موسىٰ نبىّ اللّٰه أفضل مرتبة فى هذا المعنى من موسى بن عمران صلّى اللّٰه عليه وعلى نبيّنا وسلّم ، لأنّ اليهود سمعته من من نبىّ من الأنبياء وموسىٰ صلّى اللّٰه عليه وعلى نبيّنا وسلّم سمعه مخلوقا فى شجرة ، ولو كان مخلوقا فى شجرة لم يكن اللّٰه عزّ وجلّ مكلّما لموسىٰ من وراء حجاب ، ولأنّ كلام اللّٰه عزّ وجلّ لموسىٰ عليه السّلام لو كان مخلوقا فى شجرة

كما زعموا لزمهم أن تكون الشّجرة بذلك الكلام متكلّمة ، ووجب عليهم أنّ مخلوقا من المخلوقين كلّم موسىٰ وقال له : إنّني أنا اللّٰه لا إله إلّا أنا فاعبدني ، وهذا ظاهر الفساد ... ''اگر اللہ تعالیٰ کا کلام صرف کسی مخلوق چیز میں مخلوق ہو کر ہی پایا جائے تو ان قیود میں سے کسی کی شرط لگانے کا کوئی معنیٰ نہیں، کیونکہ تمام مخلوق اس کو غیر اللہ سے سننے میں برابر ہے اور یہ جہمی لوگوں کے ہاں غیر اللہ میں پیدا شدہ ہے۔ یہ چیز انبیاء کے مقام و مرتبہ کو کم کرنے کا سبب بنتی ہے۔ جب وہ یہ دعویٰ کریں کہ اللہ تعالیٰ کی موسیٰ علیہ السلام سے کلام ایک درخت میں پیدا کی گئی تھی تو ان پر لازم آتا ہے کہ جن لوگوں نے اس کلام کو کسی فرشتے یا نبی سے سنا ہے، جو اسے اللہ کی طرف سے لے کر آیا تھا، وہ لوگ اس کلام کو سننے میں موسیٰ علیہ السلام سے بہتر و افضل ہیں، کیونکہ انہوں نے تو اس کلام کو کسی نبی سے سنا ہے، جبکہ موسیٰ علیہ السلام نے اس کلام کو اللہ تعالیٰ سے نہیں سنا، بلکہ ایک درخت سے سنا ہے، نیز ان پر لازم آتا ہے کہ وہ یہ دعویٰ کریں کہ یہودی جب اللہ کی کلام کو اللہ کے نبی موسیٰ علیہ السلام سے سنتے تھے تو وہ اس سننے میں موسیٰ بن عمران علیہ السلام سے افضل تھے، کیونکہ یہودیوں نے اسے اللہ کے نبیوں میں سے ایک نبی موسیٰ علیہ السلام سے سنا تھا، جبکہ موسیٰ علیہ السلام نے اسے ایک مخلوق درخت سے سنا تھا۔

اگر یہ کلام ایک درخت میں پیدا گیا ہوتا تو اللہ تعالیٰ پردے کے پیچھے سے موسیٰ علیہ السلام سے کلام نہیں کر رہا تھا، بلکہ اس صورت میں تو ان پر یہ کہنا لازم آتا ہے کہ وہ درخت موسیٰ علیہ السلام سے کلام کر رہا تھا اور یوں لازم آتا ہے کہ مخلوق میں سے ایک مخلوق نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام کی تھی اور انہیں کہا تھا کہ میں ہی اللہ ہوں، میری عبادت کرو اور یہ واضح طور پر فاسد بات ہے۔۔۔'' (الاعتقاد للبیہقی : ۹۷۔۹۸)

شیخ الاسلام ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ (۶۶۱۔۷۲۸ھ) لکھتے ہیں: ومن قال إنّه بنفسه لم يناد ، ولكن خلق نداء في شجرة أو غيرها لزم أن تكون الشّجرة هي القائلة : إنّي أنا اللّٰه ، وليس هذا كقول النّاس : نادى الأمير ، إذ أمر مناديا ، فإنّ المنادي عن الأمير يقول : أمر الأمير بكذا ورسم السّلطان بكذا ، لا يقول : أنا أمرتكم ، ولو قال ذلك لأهانه النّاس ، والمنادي قال لموسىٰ : إنّني أنا اللّٰه لا إله إلّا أنا فاعبدني ، إنّي أنا اللّٰه ربّ العالمين ، وهذا لا يجوز أن يقوله ملك إلّا إذا بلغه عن اللّٰه كما نقرأ نحن القرآن ، والملك إذا أمره اللّٰه بالنّداء قال ، كما ثبت في الصّحيح عن النّبيّ

صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم أنّہ قال : ((إذا أحبّ اللّٰہ عبدا نادی جبریل : إنّی أحبّ فلانا فأحبّہ ، ثمّ ینادی جبریل فی السّماء : إنّ اللّٰہ یحبّ فلانا فأحبّوہ ...)) فجبریل إذا نادی فی السّماء قال : إنّ اللّٰہ یحبّ فلانا ، فأحبّوہ ، واللّٰہ إذا نادی جبریل یقول : یا جبریل ! إنّی أحبّ فلانا ، ولھذا نادت الملٰئکۃ زکریّا ، قال تعالیٰ : ﴿ فَنَادَتْهُ الْمَلٰئِكَةُ وَهُوَ قَائِمٌ يُّصَلِّي فِي الْمِحْرَابِ أَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى ...﴾ ، وقال : ﴿ وَإِذْ قَالَتِ الْمَلٰئِكَةُ يَا مَرْيَمُ إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفَاكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفَاكِ عَلٰى نِسَاءِ الْعَالَمِيْنَ ﴾ ، ولا یجوز قطّ لمخلوق أن یقول : من یدعونی فأستجیب لہ ، من یسألنی فأعطیہ ، من یستغفرنی فأغفر لہ ، واللّٰہ تعالیٰ إذا خلق صفۃ فی محلّ کان المحلّ متصفا بھا ، فإذا خلق فی محلّ علما أو قدرۃ أو حیاۃ أو حرکۃ أو لونا أو سمعا أو بصرا کان ذلک المحلّ ھو العالم بہ القادر المتحرّک الحیّ المتلوّن السّمیع البصیر ، فإنّ الرّبّ لا یتصف بما یخلقہ فی مخلوقاتہ ، وإنّما یتّصف بصفاتہ القائمۃ بہ ، بل کلّ موصوف لا یوصف إلّا بما یقوم بہ ، لا بما یقوم بغیرہ ولم یقم بہ ، فلو کان النّداء مخلوقا فی شجرۃ لکانت ھی القائلۃ : إنّی أنا اللّٰہ ، وإذا کان ما خلقہ الرّبّ فی غیرہ کلاما لہ ، ولیس لہ کلام إلّا ما خلقہ لزم أن یکون إنطاقہ لأعضاء الإنسان یوم القیامۃ کلاما لہ ، وتسبیح الحصٰی وتسلیم الحجر علی الرّسول کلام لہ ، بل یلزم أن یکون کلّ کلام فی الوجود کلامہ ، لأنّہ قد ثبت أنّہ خالق کلّ شیء ، وھکذا طرد قول الحلولیّۃ الاتّحادیّۃ کابن عربیّ ، فإنّہ قال : وکلّ کلام فی الوجود کلامہ ، سواء علینا نثرہ ونظامہ ...

''جو شخص یہ کہے کہ (موسیٰ علیہ السلام کو) خود اللہ تعالیٰ نے نہیں پکارا تھا، بلکہ درخت وغیرہ میں پکار پیدا کر دی تھی، اس کو لازم آئے گا کہ یہ درخت ہی کہنے والا تھا کہ میں ہی اللہ ہوں، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ یہ اس طرح نہیں جیسے لوگ کہتے کہ امیر نے آواز لگائی ہے، جب وہ کسی منادی کرنے والے کو بھیجے، کیونکہ امیر کی طرف سے منادی کرنے والا کہتا ہے کہ امیر نے یہ حکم دیا ہے اور بادشاہ نے یہ قانون لاگو کیا ہے۔ وہ یہ نہیں کہتا کہ میں تمہیں حکم دے رہا ہوں۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو لوگ اس کی بے عزتی

کریں گے۔ پکارنے والے نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا کہ میں ہی اللہ ہوں، لہٰذا میری ہی عبادت کرو، میں ہی اللہ ربّ العالمین ہوں۔ ایسا تو کسی فرشتے کے لیے بھی جائز نہیں ہوتا، جب وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی پیغام پہنچا رہا ہو، جیسا کہ ہم قرآنِ کریم میں پڑھتے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ فرشتے کو نداء کا حکم دیتا ہے، جیسا کہ صحیح بخاری میں ثابت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو جبریل کو فرماتا ہے کہ میں فلاں آدمی سے محبت کرتا ہوں، تو بھی اس سے محبت کر، پھر جبریل آسمانوں میں نداء لگاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فلاں آدمی سے محبت کرتا ہے، تم سب اس سے محبت کرو۔ اب جبریل جب آسمانوں میں نداء لگاتا ہے تو کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فلاں آدمی سے محبت کرتا ہے، تم بھی اس سے محبت کرو اور اللہ تعالیٰ جب جبریل کو بلاتا ہے تو فرماتا ہے، اے جبریل! میں فلاں آدمی سے محبت کرتا ہوں۔ اسی لیے جب فرشتوں نے زکریا علیہ السلام کو پکارا تھا تو فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ فَنَادَتْهُ الْمَلٰئِكَةُ وَهُوَ قَائِمٌ يُّصَلِّي فِي الْمِحْرَابِ أَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى ... ﴾ (ان کو فرشتوں نے پکارا اس حال میں کہ وہ کھڑے محراب میں نماز ادا کر رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو یحییٰ کی خوشخبری دیتے ہیں)، نیز فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ وَإِذْ قَالَتِ الْمَلٰئِكَةُ يَا مَرْيَمُ إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفَاكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفَاكِ عَلٰى نِسَاءِ الْعَالَمِيْنَ ﴾ (اور جب فرشتوں نے کہا، اے مریم! بے شک اللہ تعالیٰ نے تجھے چن لیا ہے اور پاک کر دیا ہے اور تجھے تمام جہانوں کی عورتوں پر چن لیا ہے)۔ کسی مخلوق کے لیے قطعاً جائز نہیں ہے کہ وہ کہے کہ میں ہی اللہ رب العالمین ہوں، نہ ہی کوئی مخلوق یہ کہہ سکتی ہے کہ کون ہے جو مجھے پکارے تو میں اس کی دُعا کو قبول کروں، کون ہے جو مجھ سے سوال کرے تو میں اس کو عطا کروں، کون ہے جو مجھ سے معافی مانگے تو میں اس کو معاف کر دوں؟ جب اللہ تعالیٰ کسی جگہ میں کسی صفت کو پیدا کرتا ہے تو وہی جگہ اس صفت کے ساتھ موصوف ہوتی ہے، چنانچہ جب اللہ تعالیٰ کسی میں علم، قدرت، زندگی، حرکت، رنگ، سمع یا بصر پیدا کرتا ہے تو وہی (جس میں یہ صفت پیدا کی گئی ہوتی ہے) اس کا عالم، اس کی قدرت رکھنے والا، متحرک، زندہ، رنگ دار، سمیع اور بصیر ہوتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ اس چیز کے ساتھ متصف نہیں ہوتا، جسے وہ اپنی کسی مخلوق میں پیدا کر دیتا ہے، وہ صرف انہی صفات کے ساتھ متصف ہوتا ہے، جو اسی میں قائم ہوتی ہیں، کسی دوسرے میں قائم نہیں ہوتیں، لہٰذا اگر نداء درخت میں پیدا کر دی گئی تھی تو وہی درخت یہ کہہ رہا تھا کہ میں ہی اللہ ہوں۔ اگر وہ کلام جسے اللہ تعالیٰ اپنے غیر

میں پیدا کردے، اسی کی کلام ہو تو لازم آئے گا کہ روزِ قیامت اللہ تعالیٰ کا انسان کے اعضاء کو بلوانا اللہ ہی کی کلام ہو، کنکریوں کا تسبیح کرنا بھی اللہ کی کلام ہو اور پتھر کا رسولِ کریم ﷺ پر سلام کرنا بھی اللہ ہی کی کلام ہو، بلکہ یہ بھی لازم آئے گا کہ کائنات میں ہر کلام اللہ تعالیٰ ہی کی ہو، کیونکہ یہ بات ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہی ہر چیز کو پیدا کیا ہے۔ حلول و اتحاد کے قائلین، جیسے ابنِ عربی ہے، ان کا یہی قول ہے، اس کا کہنا ہے کہ کائنات میں ہر کلام اسی اللہ ہی کی کلام ہے، خواہ وہ نثر ہو یا نظم۔۔۔''

(منهاج السنة لابن تيمية : ٢١٩/٢)

امام ابنِ ابی العز الحنفی (م۷۹۲ھ) لکھتے ہیں: **وما أفسد استدلالهم بقوله تعالىٰ : ﴿ نُودِيَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِي الْأَيْمَنِ فِي الْبُقْعَةِ الْمُبَارَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ ...﴾ على أنّ الكلام خلقه اللّٰه تعالىٰ في الشّجرة ، فسمعه موسى منها ! وعموا عمّا قبل هذه الكلمة وما بعدها ، فإنّ اللّٰه قال : ﴿ فَلَمَّا أَتَاهَا نُودِيَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْأَيْمَنِ...﴾ ، النّداء هو الكلام من بُعد ، فسمع موسى عليه السّلام النّداء من حافة الوادي ، ثمّ قال : ﴿ فِي الْبُقْعَةِ الْمُبَارَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ ﴾ أي أنّ النّداء كان في البقعة المباركة من عند الشّجرة ، كما يقول سمعت كلام زيد من البيت ، يكون من البيت لابتداء الغاية ، لا أنّ البيت هو المتكلّم ! ولو كان الكلام مخلوقا في الشّجرة لكانت الشّجرة هي القائلة : ﴿ يَا مُوسَىٰ إِنِّي أَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ ﴾ ، وهل قال : إنّي أنا اللّٰه ربّ العالمين ، غير ربّ العالمين ؟ ولو كان هذا الكلام بدا من غير اللّٰه لكان قول فرعون : أنا ربّكم الأعلى صدقا إذ كلّ من كلامين عندهم مخلوق قد قاله غير اللّٰه ! وقد فرّقوا بين الكلامين على أصولهم الفاسدة : أنّ ذاك كلام اللّٰه خلقه اللّٰه في الشّجرة ، وهذا كلام خلقه فرعون ! فحرّفوا وبدّلوا واعتقدوا خالقا غير اللّٰه ...**

''ان (جہمی لوگوں کا) اس فرمانِ باری تعالیٰ: ﴿ نُودِيَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِي الْأَيْمَنِ فِي الْبُقْعَةِ الْمُبَارَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ ...﴾ سے اس بات پر استدلال کتنا فاسد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کلام کو درخت میں پیدا کیا، پھر موسیٰ علیہ السلام نے اس سے سنا، وہ اس فرمانِ باری تعالیٰ کے ماقبل اور مابعد سے اندھے بن گئے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ فَلَمَّا أَتَاهَا نُودِيَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ

الْأَيْمَنِ... ﴾ نداء تو دور سے کلام کرنے کو کہتے ہیں اور موسیٰ علیہ السلام نے کلام کو وادی کے اندر سے سنا تھا، پھر فرمان ہوا: ﴿ فِي الْبُقْعَةِ الْمُبَارَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ ﴾ یعنی نداء بقعۂ مبارکہ میں درخت کے پاس سے تھی، جیسا کہ کوئی آدمی کہتا ہے کہ میں نے زید کی کلام کو گھر سے سنا، گھر سے کا لفظ ابتدائے غایت کے لیے ہوتا ہے، یہ نہیں کہ گھر کلام کر رہا تھا۔ اگر یہ کلام مخلوق ہوتی اور درخت میں پیدا کی گئی ہوتی تو درخت ہی یہ کہنے والا ہوتا کہ اے موسیٰ میں ہی رب العالمین ہوں۔ کیا رب العالمین کے علاوہ کسی اور نے کہا تھا کہ میں رب العالمین ہوں؟ اگر یہ کلام غیر اللہ سے ظاہر ہوئی تھی تو پھر فرعون کا یہ کہنا سچ تھا کہ میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں! کیونکہ دونوں کلامیں جہمیوں کے ہاں مخلوق ہیں اور دونوں کا قائل غیر اللہ ہے، لیکن انہوں نے اپنے فاسد اصولوں کے مطابق ان دونوں کلاموں میں فرق کیا ہے کہ وہ اللہ کی کلام تھی، جسے اس نے درخت میں پیدا کیا تھا اور یہ وہ کلام تھی، جسے فرعون نے پیدا کیا تھا! انہوں نے تحریف وتبدل سے کام لیا ہے اور یہ اعتقاد رکھا ہے کہ اللہ کے علاوہ بھی کوئی خالق ہے۔۔۔''

(شرح العقيدة الواسطية : ١٧٤ـ١٧٥)

تنبیہ : سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

رأيت الشّجرة الّتي نودي منها موسىٰ عليه السّلام ، سمرة خضراء ...

''میں نے اس درخت کو دیکھا ہے، جس سے موسیٰ علیہ السلام کو آواز دی گئی تھی، وہ سرسبز تھا۔''

(تفسير ابن جرير : ٥٧٣/١٩)

تبصرہ : اس قول کی سند سخت ''ضعیف'' ہے، کیونکہ:

① اس کا راوی سفیان بن وکیع جمہور کے نزدیک ''ضعیف'' ہے۔ ② امام ابومعاویہ ''مدلس'' ہیں۔ ③ امام اعمش بھی ''مدلس'' ہیں۔ اور یہ دونوں امام ''عن'' سے بیان کر رہے ہیں۔ ④ ابوعبیدہ نے اپنے باپ سے نہیں سنا، جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

فإنّه عند الأكثر لم يسمع من أبيه۔۔۔ ''جمہور کے نزدیک اس (ابوعبیدہ) نے اپنے والد (سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ) سے سماع نہیں کیا۔'' (موافقة الخبر الخبر لابن حجر : ٣٦٤/١)

لہٰذا حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ (تفسير ابن كثير : ١٧/٥) کا اس کے بارے میں **إسناده مقارب** کہنا صحیح نہیں۔

قارئین کے سوالات

غلام مصطفیٰ ظہیر امن پوری

سوال : مرد کے لیے کانوں کو چھیدوا کر بالیاں وغیرہ ڈالنا شرعاً کیسا ہے؟

جواب : بچے یا مرد کے لیے کانوں کو چھیدوانا اور ان میں بالیاں وغیرہ ڈالنا شرعاً جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ عورتوں کے ساتھ مشابہت ہے، جو کہ حرام ہے۔ حافظ ابنِ قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''بچے کے کان کو چھید کرانے میں نہ کوئی دنیاوی مصلحت ہے، نہ ہی دینی۔ صرف اس کے اعضاء میں سے ایک عضو کو کاٹنا ہے، جو کہ جائز نہیں ہے۔'' (تحفة المودود باحکام المولود : ۱۴۳)

ابن النحاس لکھتے ہیں: **وذلک بدعة یجب إنکارها والمنع منها .**

''بچے کے کان کو چھیدوانا بدعت ہے، اس کا انکار کرنا اور اس سے منع کرنا واجب ہے۔''

(تنبیه الغافلین لابن النحاس)

فائدہ : سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، جس میں بچے کے متعلق سات چیزوں کو سنت کہا گیا ہے، ان میں سے ایک اس کے کانوں کو چھیدوانا بھی ہے۔

(المعجم الاوسط للطبرانی : ۱۷۶/۱، ح : ۵۵۸)

تبصرہ : اس روایت کی سند ''ضعیف'' ہے، کیونکہ اس کا راوی رواد بن جراح اگرچہ جمہور کے نزدیک ''حسن الحدیث'' ہے، لیکن آخری عمر میں اختلاط کا شکار ہو گیا تھا، اس بنا پر ''متروک'' قرار پایا۔ جیسا کہ اس کے بارے میں حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

صدوق اختلط بأخرة ، فترک ، وفي حدیثه عن الثّوريّ ضعف شدید .

''یہ صدوق راوی ہے، لیکن آخری عمر میں اختلاط کا شکار ہو گیا تھا، اس کی سفیان ثوری رحمہ اللہ سے حدیث میں سخت کمزوری ہے۔'' (تقریب التهذیب لابن حجر : ۱۹۵۸)

القاسم بن مساور الجوہری اور یحیی بن المساور الجوہری دونوں کے بارے میں کسی نے ذکر نہیں کیا کہ انہوں نے رواد سے اختلاط سے پہلے سنا ہو، لہٰذا سند ''ضعیف'' ہے۔

لطیفہ : ابوالحسن علی بن اسحاق بن راہویہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میرے باپ اسحاق بن

راہویہ رحمہ اللہ کے کان پیدائشی طور پر چھیدے ہوئے تھے تو میرے دادا راہویہ، الفضل بن موسیٰ السینانی کے پاس گئے، ان سے اس بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا، آپ کا بیٹا یا تو انتہائی اچھا انسان ہوگا یا انتہائی برا ہوگا۔(تاریخ بغداد للخطیب البغدادی : ٣٤٧/٦، وسندہٗ حسنٌ)

حافظ ذہبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: **هذا إسناد جيّد وحكاية عجيبة ...**

''اس کی سند حسن ہے اور یہ حکایت عجیب ہے۔''(سیر اعلام النبلاء للذهبی : ٣٨٠/١١)

حافظ ابنِ قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''گویا کہ امام الفضل بن موسیٰ یوں سمجھے کہ جس طرح یہ بچہ اس خاصیت میں دوسروں سے منفرد ہے، اسی طرح یہ دین یا دنیا میں دوسروں سے منفرد ہوگا۔''

(تحفة المودود : ١٤٣)

امام اسحاق بن راہویہ المروزی رحمہ اللہ (١٦١۔٢٣٨ھ) کے بارے میں امام خطیب بغدادی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: **كان أحد أئمّة المسلمين وعَلَمًا من أعلام الدّين ، اجتمع له الحديث ، والفقه ، والحفظ ، والصّدق ، والورع ، والزّهد ...**

''آپ مسلمانوں کے اماموں میں سے ایک امام ہیں، ان کے پاس حدیث، فقہ، حفظ، صدق، ورع اور زہد سب کچھ جمع ہوگیا تھا۔۔۔''(تاریخ بغداد للخطیب : ٣٤٥/٦)

آپ رحمہ اللہ نے بلادِ خراسان میں جہمیوں اور دیگر اہل بدعت کا خوب ردّ کیا، سنت کی بالادستی اور صحیح اسلامی عقائد کی نشر واشاعت میں بھرپور کردار ادا کیا۔

فائدہ : بچی یا عورت کے لیے کانوں میں چھید کروانا جائز اور درست ہے، کیونکہ عورت زینت کے لیے زیور کی محتاج ہے، اس کے جواز پر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ام زرع دلیل ہے۔اس میں ہے کہ گیارویں عورت نے اپنے خاوند کے بارے میں کہا **أناس من حليّ أذني .** (اس نے زیورات سے میرے کان لٹکا دیئے۔''

(صحیح بخاری : ٧٨٠/٢، ٥١٨٩، صحیح مسلم : ٢٨٨/٢، ٩٢/٢٤٤٨)

سیدنا ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ عید کے بعد عورتوں کو صدقہ کی ترغیب دلائی تو **فجعلت المرأة تلقى قرطها .**

''عورت اپنی بالیاں اتارنے لگی۔''

(صحیح بخاری : ۸۷٤/۲، ح : ۵۸۷۳، صحیح مسلم : ۲۹۰/۱، ح : ۸۹۰)

محمد بن محمود الاسروشنی الحنفی (م ۶۳۲ھ) لکھتے ہیں:

ولا بأس بثقب أذن الطّفل من البنات ، لأنّهم كانوا يفعلون ذلك زمن النّبيّ صلّى الله عليه وسلّم من غير إنكار ...

''بچیوں کے کانوں کو چھیدوانے میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ لوگ عہدِ نبوی میں بغیر انکار کے ایسا کرتے تھے۔۔۔'' (جامع احکام الصغار : ۱۲۲/۲)

الحاصل : مرد کے لیے کانوں کو چھیدوانا اور ان میں بالیاں وغیرہ ڈالنا قطعاً جائز نہیں ہے، بلکہ عورتوں سے مشابہت کی بنا پر حرام ہے۔ افسوس ہے کہ مسلمان نوجوان کافروں کی نقالی میں شریعت مطہرہ کی مخالفت پر کمر بستہ ہو گئے ہیں۔

سوال : بعض کلاتھ ہاؤسز اور گارمنٹس سٹورز میں مجسمے (Dummies) رکھے ہوتے ہیں، ان کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب : دوکانوں پر عورتوں یا مردوں کے مجسمے (Dummies)، تماثیل وتصاویر کو ناقابلِ اعتناء لباس پہنا کر سر بازار رکھنا حرام اور ناجائز ہے۔ یہ غیرتِ ایمانی کے بھی منافی ہے۔

اسی طرح کی تصاویر وتماثیل اور مجسموں سے عورتوں کو بے حیائی اور عریانی وفحاشی کی طرف راغب کیا جاتا ہے۔ یہ بے ہودگی، انتہا درجہ کی بداخلاقی اور بے حیائی وفحاشی والی روش ہے، جو دینِ اسلام کے پاکیزہ مزاج کے سراسر خلاف ہے۔ یہ قبیح فعل حرام وناجائز ہے۔ کسی سنجیدہ اور شریف الطبع انسان کو زیبا نہیں کہ وہ اس طرح کی بے ہودہ کاروائی سے اپنا مالِ تجارت فروخت کرے۔ یہ دولت کمانے کا جھوٹا حیلہ ہے۔

اگر ان مجسموں کا سر نہ بھی ہو، تب بھی ان سے بے ہودگی اور غیر سنجیدگی کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ اس سے کسی انسان کی بری ذہنیت کی عکاسی ہوتی ہے۔ ان ڈمیوں کی حرمت وممانعت پر درج ذیل دلائل وارد ہوئے ہیں۔

دلیل نمبر ①، ② : حرمتِ تصویر اور اللہ تعالیٰ کی تخلیق کی مشابہت

تصویر امتِ مسلمہ میں سب سے بڑا فتنہ ہے۔ نبئ اکرم ﷺ نے اسے مٹانے کا حکم فرمایا ہے،

اس سے منع بھی فرمایا اور اس فعل قبیح کے مرتکب کو سخت وعید بھی فرمائی، چنانچہ:

(ا) سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے فرمایا، ان لوگوں سے بڑھ کر ظالم کون ہوں گے، جو میری تخلیق کی طرح تخلیق کی کوشش کرنے لگیں۔ ان کو چاہیے کہ وہ ایک ذرہ، ایک دانہ یا ایک جو ہی پیدا کریں۔'' (صحیح بخاری: ٥٩٥٣، صحیح مسلم: ٢١١١)

(ب) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جس نے دنیا میں کوئی تصویر بنائی، روزِ قیامت اُسے اس میں روح پھونکنے پر مجبور کیا جائے گا، لیکن وہ پھونک نہ سکے گا۔'' (صحیح بخاری: ٥٩٦٣، صحیح مسلم: ٢١١٠)

(ج) سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

أشدّ النّاس عذابا يوم القيامة رجل قتله نبيّ أو قتل نبيّا وإمام ضلالة وممثّل من الممثّلين . ''قیامت کے روز سب سے سخت عذاب میں وہ آدمی ہوگا، جس نے کسی نبی کو قتل کیا ہوگا یا کسی نبی نے اسے قتل کیا ہوگا اور گمراہ امام اور تصویر سازوں میں سے تصویر ساز۔''

(مسند الامام احمد: ٤٠٧/١، وسندهٗ حسنٌ)

تصویر ایسا فتنہ ہے، جو شرک جیسے فتنے تک پہنچنے کا وسیلہ اور ذریعہ ہے۔ یہ اللہ کی تخلیق کی مشابہت ہے۔ یہ بے حیائی وفحاشی کا باعث ہے۔ یہ کفار کی مشابہت بھی ہے۔

دلیل نمبر ③ : رحمت کے فرشتوں کے لیے رکاوٹ

فرمانِ رسول ہے: ((**لا تدخل الملائكة بيتا فيه تماثيل أو تصاوير**)) ''اس گھر میں (رحمت کے) فرشتے داخل نہیں ہوتے، جس میں مورتیاں یا تصاویر ہوں۔'' (صحیح مسلم: ٢١١٢)

ظاہر ہے کہ جس گھر میں رحمت کے فرشتے داخل نہ ہوں، اس میں رحمت و برکت کیسے آسکتی ہے؟

دلیل نمبر ④ : یہ فحاشی ہے

فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ **إِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ أَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِيْ الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَهُم عَذَابٌ أَلِيْمٌ فِيْ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ...** ﴾ (النور: ١٩/٢٤)

''بلاشبہ جو لوگ مؤمنوں میں بے حیائی پھیلانا چاہتے ہیں، ان کے لیے دنیا و آخرت میں دردناک عذاب ہے۔''

حیاسوز سائن بورڈ، مختلف کمپنیوں کی تصاویر پر مبنی اشیاء کی ایڈورٹائزمنٹ سب حرام وممنوع ہیں۔

دلیل نمبر ⑤ : کفار سے مشابہت

امام مسلم بن صبیح کہتے ہیں کہ میں مسروق تابعی رحمہ اللہ کے ساتھ ایک مکان میں تھا، جس میں سیدہ مریم علیہا السلام کی مورتیاں تھیں، مسروق فرمانے لگے، یہ کسریٰ کی مورتیاں ہیں، میں نے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے یہ سنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، قیامت کے دن سب سے زیادہ عذاب تصویر بنانے والوں کو ہوگا۔(صحیح بخاری :٥٩٥٠، صحیح مسلم : ٢١٠٩)

معلوم ہوا کہ مورتیاں اور مجسمہ جات(Dummies) بنانا کفار کا شیوہ ہے، لہٰذا یہ حرام وناجائز اور گناہ ہے۔ گناہ رزق سے محرومی کا باعث ہے۔

سوال: کیا حائضہ کا پسینہ پاک ہے؟

جواب: حائضہ کا پسینہ پاک ہے، جیسا کہ:

① نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: **((إنّ المؤمن لا ینجس))**

''بے شک مومن نجس (ناپاک) نہیں ہوتا۔'' (صحیح مسلم : ٣٧٢)

② نافع رحمہ اللہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں بیان کرتے ہیں:

أنّهٗ كان يعرق في الثّوب ، وهو جنب، ثمّ يصلّي فيه .

''آپ کو جنابت کی حالت میں جن کپڑوں میں پسینہ آتا، پھر (غسل کے بعد) انہی میں نماز پڑھ لیتے۔''(مصنف ابن أبی شیبہ: ١/ ١٩١، وسندہٗ صحیح)

③ امام ابن جریج رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ امام عطاء بن ابی رباح رحمہ اللہ نے فرمایا:

لا بأس أن يعرق الجنب والحائض في الثّوب ، يصلّي فيه .

''جنبی یا حائضہ کو جن کپڑوں میں پسینہ آیا ہو، ان میں نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں۔''

(سنن دارمی: ١٠٦٧، وسندہٗ حسن)

④ علاء بن مسیّب رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''میں نے امام حمّاد بن ابی سلیمان رحمہ اللہ سے سوال کیا کہ حائضہ عورت کو اگر کپڑوں میں پسینہ آجائے، تو کیا وہ ان کو دھوئے گی؟ آپ نے فرمایا، ایسا تو مجوسی کرتے ہیں۔''(مصنف ابن أبی شیبة :١٩١/١، وسندہٗ حسن)

بچے کو دودھ چھڑانے کی مدت

حافظ ابو یحییٰ نورپوری

شریعتِ اسلامیہ کے مطابق کامل مدتِ رضاعت دو سال ہے، دو سال کے بعد شرعی اعتبار سے رضاعت کا حکم ثابت نہیں ہوتا۔ امام ابوحنیفہ کی طرف منسوب مدتِ رضاعت اڑھائی سال ہے۔ اس قول پر کوئی شرعی دلیل نہیں، بلکہ یہ قرآنِ مجید کے خلاف فیصلہ ہے، جیسا کہ:

① فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ ﴾ (البقرة : ۲/۲۳۳)

''مائیں اپنی اولادوں کو دو مکمل سال دودھ پلائیں، یہ اس کے لیے ہے، جو رضاعت کو مکمل کرنا چاہے (ورنہ والدین رضامندی سے بچے کی رضاعت کو کم کر سکتے ہیں)۔''

یہ آیتِ کریمہ نصِ جلی ہے کہ دودھ پلانے کی کامل شرعی مدت، جس سے حرمت ثابت ہوتی ہے، وہ دو سال ہے، اس آیتِ کریمہ سے یہ مسئلہ صحابہ کرام کے اجماع سے ثابت ہے، جیسا کہ ہم آئندہ ذکر کریں گے۔ ان شاء الله !

اس قرآنی نص کے خلاف امام ابوحنیفہ کا فتویٰ ملاحظہ فرمائیں:

وكان أبو حنيفة رحمه الله يحتاط بستّة أشهر بعد الحولين ، فيقول : يحرّم ما كان في الحولين وبعدهما إلى تمام ستّة أشهر ، وذلك ثلاثون شهرا ، ولا يحرّم ما كان بعد ذلك . ''ابوحنیفہ دو سال کے بعد چھ ماہ کے ساتھ احتیاط کرتے تھے اور فرماتے تھے، دو سال اور ان کے بعد چھ ماہ مکمل ہونے تک حرمت ثابت ہو جاتی ہے، یہ تیس مہینے بنتے ہیں۔ اس کے بعد حرمت ثابت نہیں ہو گی۔'' (مؤطا امام محمد : ۲/۶۰۲)

علامہ عبدالحئی لکھنوی حنفی اس قول کا ردّ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

فيه إشارة إلى أنّه حكم مبنيّ على الاحتياط ، وليس أمرا ثابتا بالنّصّ ، ولا يخفى أنّه لا احتياط بعد ورود النّصّ بالحولين مع أنّ الاحتياط هو العمل بأقوى الدّليلين وأقواهما دليلا قولهما . ''اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ

حکم احتیاط پر مبنی ہے، نص سے ثابت بات نہیں ۔ یہ بات مخفی نہیں ہے کہ دو سال کی نص وارد ہو جانے کے بعد کوئی احتیاط والی بات نہیں ہوتی ۔ ساتھ ساتھ یہ بات بھی ہے کہ دو دلیلوں میں سے زیادہ قوی دلیل پر عمل کرنا ہی احتیاط ہوتی ہے اور دلیل کے اعتبار سے (امام ابوحنیفہ کے مقابلہ میں) ان دونوں (ابو یوسف و محمد بن حسن) کا قول (دو سال ہی مدتِ رضاعت والا قول) زیادہ قوی ہے۔''

(التعليق الممجّد على مؤطا محمد از عبدالحی اللکنوی : ۶۰۲/۲، طبع بیروت)

علامہ عبدالحئ لکھنوی حنفی نے حق گوئی سے کام لیتے ہوئے امام صاحب کے مذہب کو بے دلیل اور بے ثبوت قرار دیا ہے، نیز یہ ثابت کیا ہے کہ قرآن و حدیث کے خلاف مذہب میں احتیاط کہاں، احتیاط تو دلیل شرعی کا نام ہے۔

شبہ نمبر ① : فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَإِنْ أَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ﴾ (البقرۃ : ۲۳۳/۲)

''اگر وہ دونوں (والدین) اپنی رضامندی اور باہم مشورہ سے دودھ چھڑانے کا ارادہ کریں تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں۔''

اس آیت میں فإن کی فا تعقیب کے لیے ہے، جو اس بات پر دلیل ہے کہ دودھ دو سال کے بعد چھڑایا جائے گا، اس سے معلوم ہوا کہ دو سال کے بعد بھی مدتِ رضاعت ہو سکتی ہے، نیز یہ معلوم ہوا کہ یہ آیت مدتِ رضاعت کی حد بتانے کے لیے نہیں، بلکہ اس سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ باپ کے ذمہ دودھ پلانے والی مطلقہ بیوی کا خرچ دو سال کے دائرہ میں لازم ہے، اس سے زائد میں نہیں۔

(جواب) : یہ شبہ فرمانِ باری تعالیٰ: ﴿لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ﴾ (البقرۃ : ۲۳۳/۲) (جو رضاعت مکمل کرنا چاہے، وہ دو سال دودھ پلائے) کے خلاف ہے۔

نیز یہ شبہ فقہ حنفی کے مفتیٰ بہ قول کے بھی خلاف ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ علمائے حق میں سے کوئی بھی اس آیتِ کریمہ سے یہ مسئلہ ثابت نہیں کرتا کہ دو سال کے بعد بھی مدتِ رضاعت باقی رہتی ہے، بلکہ ائمہ و علمائے کرام کی تصریحات اس کے خلاف ہیں۔ علامہ عبدالحئ لکھنوی حنفی لکھتے ہیں:

فإنّ كلّ عارف بأساليب الكلام الإلهي يعلم أنّ المراد به الفصال في الحولين

، **لا بعده ...** ''کلامِ الٰہی کے اسلوبوں کو جاننے والا ہر شخص جان لے گا کہ یہاں مراد دوسالوں کے اندر اندر دودھ چھڑانا ہے، نہ کہ اس کے بعد۔۔۔''

(عمدة الرعاية فی شرح الوقاية : ٢٠٦/٣)

نیز ابنِ ہمام حنفی نے اس پر یہ اعتراض اُٹھایا ہے کہ:

وقد يقال : كون الدّليل دلّ على بقاء مدّة الرّضاع المحرّم بعد الحولين .

''اور بسا اوقات (اس تاویل پر) یہ اعتراض بھی کیا جاتا ہے کہ پھر دوسال کے بعد مدتِ رضاعت، جس سے حرمت ثابت ہوتی ہے باقی رہنے پر کیا دلیل ہے؟''(فتح القدير : ٣٩٥/٧)

ابنِ ہمام حنفی کی مراد یہ ہے کہ اگر آیتِ کریمہ میں دوسال سے اوپر بھی مدتِ رضاعت ہونے پر دلیل موجود ہے تو پھر دوسال کے بعد صرف چھ ماہ کی مدت مقرر کرنے پر کیا دلیل ہے؟ نیز اس آیتِ کریمہ کے بارے میں لکھتے ہیں: **المراد به قبل الحولين .**

''اس سے مراد دوسال مکمل ہونے سے پہلے (پہلے دودھ پلانا) ہے۔''(فتح القدير : ٣٩٦/٥)

امام قتادہ بن دعامہ تابعی رحمہ اللہ (م ١١٣ھ) اس آیتِ کریمہ کے بارے میں فرماتے ہیں:

إذا أرادت الوالدة أن تفصل ولدها قبل الحولين ، فكان ذلك عن تراض منهما وتشاور ، فلا بأس به . ''جب والدہ اپنے بچے کو دوسال سے پہلے دودھ چھڑانے کا ارادہ کرے اور یہ کام دونوں (ماں، باپ) کی رضامندی اور باہم مشورہ سے ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔''(تفسير طبری : ٦٨/٥، وسندهٗ حسنٌ)

شیخ الاسلام امام سفیان بن سعید ثوری رحمہ اللہ (م ١٦١ھ) فرمانِ باری تعالیٰ: ﴿ **وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ** ﴾ (البقرة : ٢٣٣/٢) کے بارے میں فرماتے ہیں: **والتّمام الحولان ، قال : فإذا أراد أب أن يفطمه قبل الحولين ، ولم ترض له المرأة ، فليس له ذلك ....**

''مکمل مدتِ رضاعت دوسال ہے، جب باپ دوسال سے پہلے دودھ چھڑانے کا ارادہ کرے اور عورت راضی نہ ہو تو اس کے لیے ایسا کرنا جائز نہیں۔''(تفسير الطبری : ٣٥/٥، وسندهٗ صحيحٌ)

امام طبری رحمہ اللہ (م ٣١٠ھ) فرماتے ہیں: **وأولى التّأويلين بالصّواب تأويل**

من قال : فإن أرادا فصالا فى الحولين عن تراض منهما وتشاور ، لأنّ تمام الحولين غاية لتمام الرّضاع وانقضائه ، ولا تشاور بعد انقضائه ، وإنّما التّشاور والتّراضى قبل انقضاء نهايته ... ”دونوں تفسیروں میں سے اولیٰ بالصواب تفسیر اس شخص کی ہے، جس نے کہا ہے کہ اگر والدین آپس میں رضامندی اور باہم مشورہ سے دوسال کے اندر اندر دودھ چھڑائیں (تو کوئی حرج نہیں)، کیونکہ دوسالوں کی تکمیل رضاعت کے مکمل ہونے کی انتہاء ہے۔مدت کے مکمل ہونے کے بعد مشورہ کی کوئی حیثیت نہیں۔مشورہ اور باہم رضامندی تو اس مدت کی تکمیل سے پہلے پہلے ہے۔“(تفسیر طبری : ۷۰/۵)

ابنِ عابدین حنفی نے ابنِ نجیم حنفی سے بلا ردّو تردید یہ نقل کیا ہے کہ:

فإنّما هو قبل الحولين بدليل تقييده بالتّراضى والتّشاور ، وبعدهما لا يحتاج إليهما . ”یہ (مدتِ رضاعت) دوسال سے پہلے پہلے ہے، دلیل یہ ہے کہ اسے باہم رضامندی اور آپس میں مشورہ کے ساتھ مقید کیا گیا ہے۔دوسالوں کے بعد تو اس کی کوئی ضرورت نہیں ہوگی۔“(فتاوی شامی از ابن عابدین : ۲۲۱/۳)

دیوبندیوں کے ”شیخ الاسلام“ شبیر احمد عثمانی دیوبندی اس آیت کے تحت لکھتے ہیں:

”یعنی اگر ماں باپ کسی مصلحت کی وجہ سے دوسال کے اندر ہی بچہ کی مصلحت کا لحاظ کر کے باہمی مشورہ اور رضامندی سے دودھ چھڑانا چاہیں تو اس میں گناہ نہیں۔“(تفسیر عثمانی : ص ٤٧)

جناب تقی عثمانی دیوبندی صاحب لکھتے ہیں: ”یہ تراضی اور تشاور حولین (دوسال) کے اندر اندر ہے۔حولین (دوسال) کے بعد اس کی حاجت ہی نہیں، بلکہ دودھ پلانا متعین ہے۔“(درس ترمذی از تقی : ٤٥٠/۳)

طلاق شدہ بیوی کے دودھ پلانے کی اجرت کو دوسال کے ساتھ خاص کرنا بے دلیل ہے۔اگر کوئی دوسال کے بعد بھی بچے کو دودھ پلانا چاہتا ہے تو کیا وہ دوسال کے بعد دودھ پلانے پر اجرت نہیں دے سکتا؟ یقیناً دے سکتا ہے،اس کے بارے میں کوئی مخالفت ثابت نہیں۔ **والحمد لله !**

کیا مطلقہ کا دودھ دوسال کے بعد حرام ہو جاتا ہے؟ اس لیے وہ دوسال کے بعد نہیں پلا سکتی؟ جبکہ ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔

شبہ نمبر ② : چھ ماہ اس لیے بڑھائے جاتے ہیں تا کہ بچہ کو آہستہ آہستہ دودھ کے علاوہ دوسری غذا کا عادی بنایا جا سکے، کیونکہ دودھ چھڑانے کے فوراً بعد دوسری غذا کھلانا نقصان کا باعث ہوتا ہے۔

جواب : اس شبہ کے جواب میں امام ابن ابی العز الحنفی رحمہ اللہ (م۷۹۲ھ) لکھتے ہیں:

لا يقوى ، لأنّ الطّفل يألف الطّعام قبل العامين ، فإنّ عامّة الأطفال يطعمون مع الرّضاع ، فما تنقضي السّنتان إلّا وقد ألف الطّفل الطّعام ، وخلاف هذا نادر .

''یہ بات پائیدار نہیں، کیونکہ بچہ دوسالوں سے پہلے ہی کھانے کا عادی ہو جاتا ہے، کیونکہ عام بچے رضاعت کے ساتھ ساتھ ہی کھانا کھانا شروع کر دیتے ہیں، دو سال پورے نہیں ہوتے کہ بچہ کھانے کا عادی ہو جاتا ہے، اس کا خلاف بہت نادر ہے۔'' (التنبيه على مشكلات الهداية : ۱۲۷۷/۳)

ابنِ ہمام حنفی لکھتے ہیں: **وما ذكر في وجه زيادتها لا يفيد سوى أنّه إذا أريد الفطام يحتاج إليها ليتعوّد فيها غير اللّبن قليلا قليلا لتعذّر نقله دفعة ، وأمّا أنّه يجب ذلك بعد الحولين ويكون من تمام مدّة التّحريم شرعا فليس بلازم ممّا ذكر من الأدلّة ، ولا شكّ أنّ الشّرع لم يحرّم إطعامه من غير اللّبن قبل الحولين ، ليلزم زيادة مدّة التّعوّد عليهما ، فجاز أن يعوّد مع اللّبن غيره قبل الحولين بحيث قد استقرّت العادة مع انقضائها ، فكان الأصحّ قولهما ، وهو مختار الطّحاويّ ...**

''اور مدتِ رضاعت کی زیادت کی جو توجیہ ذکر کی گئی ہے، اس کا فائدہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ جب دودھ چھڑانے کا ارادہ کیا جائے تو اس کی ضرورت ہوتی ہے تا کہ بچہ اس زائد مدت میں دودھ کے علاوہ دوسری غذا کا تھوڑا تھوڑا عادی بن جائے ، کیونکہ یک بارگی انتقال مشکل ہوتا ہے ۔رہا اس کا (رضاعت کا) دوسالوں کے بعد (چھ ماہ مزید) ضروری ہونا اور اس کا شرعی طور پر حرمت کی مدت میں زیادت بننا تو وہ بالکل نہیں۔اس بات میں تو کوئی شبہ نہیں ہے کہ شریعت نے دوسال پورے ہونے سے پہلے بچے کو کھانا کھلانا حرام قرار نہیں دیا کہ اس سے عادت بنانے کے لیے زیادت کرنا لازم آئے ۔ یہ عین ممکن ہے کہ بچے کو دوسالوں میں دودھ کے ساتھ ساتھ ہی غذا کا اس طرح عادی بنا دیا جائے کہ دوسال پورے ہوتے ہی اس کی کھانے کی عادت پختہ ہو جائے ، چنانچہ ان دونوں (ابو یوسف ومحمد) کا

قول زیادہ صحیح ہے اور امام طحاوی کا بھی مختار یہی ہے۔‘‘(فتح القدير لابن همام : ۳۹۵/۷)

یعنی یہ کام مدتِ رضاعت کے اندر بھی ہوسکتا ہے۔ نبیٔ اکرم ﷺ نے اس مدتِ رضاعت کے اندر دوسری غذا کا عادی بنانے سے منع نہیں کیا۔

علامہ قرطبی فرماتے ہیں: **قاعدة الرّضاع : فإنّ اللّٰه تعالیٰ قد قال : ﴿ وَالْـوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ ﴾** (البقرة : ۲۳۳/۲) **، فهذا أقصى مدّة الرّضاع المحتاج إليه عادة ، المعتبر شرعًا ، فما زاد عليه بمدّة مؤثّرة غير محتاج إليه عادة ، فلا يعتبر شرعًا ، لأنّه نادر ، والنّادر لا يحكم له بحكم المعتاد .** ’’رضاعت کا قانون: اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ: **﴿ وَالْـوَالِـدَاتُ يُـرْضِـعْـنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ ﴾** (البقرة : ۲۳۳/۲)، یہ رضاعت کی زیادہ سے زیادہ مدت ہے، جس کی عموماً ضرورت ہوتی ہے اور جو شرعی طور پر (حرمت میں) معتبر ہوتی ہے۔ جو مؤثر مدت اس سے زائد ہو اس کا شرعی طور پر اعتبار نہیں کیا جائے گا، کیونکہ یہ نادر ہے اور نادر پر عادت کا حکم نہیں لگایا جاتا۔‘‘

(المفهم لما اشكل من تلخيص كتاب مسلم : ۱۸۸/٤)

دلیل نمبر ② : اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُوْنَ شَهْرًا ﴾ (الاحقاف : ۱۵/٤٦)

’’اور اس (بچے) کے حمل اور دودھ چھڑانے کی مدت تیس ماہ ہے۔‘‘

اس آیتِ کریمہ میں حمل کی کم از کم مدت اور دودھ چھڑانے کی زیادہ سے زیادہ مدت بیان ہوئی ہے۔ حمل کی کم از کم مدت چھ ماہ اور دودھ چھڑانے کی زیادہ سے زیادہ مدت دو سال ہے، یوں یہ پورے تیس ماہ بن جاتے ہیں۔ مفسرِ قرآن سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت سے یہی مسئلہ ثابت کیا ہے۔ چنانچہ حافظ ابنِ کثیر رحمہ اللہ (۷۰۱-۷۷۴ھ) فرماتے ہیں:

وهو استنباط قويّ صحيح . ’’یہ استنباط واستدلال بہت قوی اور صحیح ہے۔‘‘

(تفسير ابن كثير : ٥٦٨/٥)

سیدنا ابنِ عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: **إنّي لصاحب المرأة الّتي أتى بها عمر ،**

وضعت لستّة أشهر ، فأنكر النّاس ذلک ، فقلت لعمر : لم تظلم ؟ فقال : كيف ؟ قلت له : اقرأ : ﴿ وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلاثُوْنَ شَهْرًا ﴾ ، وقال : ﴿ وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ ﴾ ، كم الحول ؟ قال : سنة ، قلت : كم السّنة ؟ قال : اثنى عشر شهرا ، قال : قلت : فأربعة وعشرون شهرا حولان كاملان ويؤخّر من الحمل ما شاء اللّٰه ويقدّم ، فاستراح عمر إلى قولي .

''جس عورت نے (خاوند کی ہم بستری کے) چھ ماہ کے بعد بچہ جن لیا تھا اور اس کو (زنا کے شبہ میں) سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے پاس لایا گیا تھا، لوگوں نے اس بات کا انکار کیا تھا (کہ چھ ماہ بعد بچہ پیدا ہونا ممکن نہیں)، اس کا صاحبِ واقعہ میں ہوں ۔ میں نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے عرض کی، آپ (اس عورت پر حدِ زنا لاگو کر کے) کیوں ظلم کرتے ہیں؟ انہوں نے کہا، کیسے، میں نے کہا، آپ یہ فرمانِ باری تعالیٰ پڑھ لیں: ، اور فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ، حول کتنا ہوتا ہے، انہوں نے فرمایا، ایک سال، میں نے کہا، ایک سال کتنا ہوتا ہے، فرمایا، بارہ ماہ، میں نے کہا، چوبیس ماہ پورے دو سال بنتے ہیں (اس میں چھ شامل کریں تو پورے تیس ہو جاتے ہیں) اور اللہ تعالیٰ حمل کو جتنا چاہے آگے اور جتنا چاہے پیچھے کرتا ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ میری بات پر مطمئن ہو گئے ۔''

(مصنف عبد الرزاق : ۳۵۲/۷، ح : ۱۳۴۴۹، وسندهٗ صحيحٌ)

سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے خطبہ ارشاد کیا، اس میں فرمایا:

إنّه رفع إليّ امرأة ولدت لستّة أشهر من حين دخل عليها زوجها ، فدخل عليه ابن عبّاس ، فقال : يا أمير المؤمنين ! قال اللّٰه عزّ وجلّ فى كتابه : ﴿ وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ ﴾ (البقرة : ۲۳۳/۲) ﴾ ، وفى آية أخرى : ﴿ وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُوْنَ شَهْرًا ﴾ (الاحقاف : ۱۵/۴۶) ، فإذا تمّت الرّضاع كان حملها ستّة أشهر ، قال : فنجت .

''میری طرف ایک عورت کا معاملہ اٹھایا گیا ہے، جس نے اپنے خاوند کی ہم بستری سے چھ ماہ بعد ہی بچہ جن دیا ہے ۔ آپ رضی اللہ عنہ کے پاس سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما آئے اور عرض کی، اے امیر المومنین! اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے: ﴿ وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ

﴿ أَرَادَ أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ ﴾ (البقرة: ۲/۲۳۳)، نیز ایک دوسری آیت میں ہے: ﴿ وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُوْنَ شَهْرًا ﴾ (الاحقاف: ۱۵/٤٦)، جب رضاعت (چوبیس ماہ) مکمل ہو جائے تو (تیس ماہ میں سے) حمل (کی کم از کم) چھ ماہ ہی رہ جاتا ہے، اس پر وہ عورت (رجم سے) بچ گئی۔''

(التوحید لابن مندة: ۱۰۱، وسندهٗ صحیحٌ)

سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے بھرے مجمع میں سیدنا ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کی فقہِ قرآنی کا تذکرہ فرمایا، کسی نے اس پر نکیر نہیں کی۔ ثابت ہوا کہ اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ کم از کم مدتِ حمل چھ ماہ اور زیادہ سے زیادہ مدتِ رضاعت دو سال ہے۔ اس پر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا اجماع ہو گیا ہے۔

شبہ نمبر ①: صاحب المبسوط اور صاحب الہدایہ نے اس آیتِ کریمہ سے اپنے امام کے مذہب پر یوں استدلال کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیتِ کریمہ میں دو چیزوں کا ذکر کر کے ان کی مدت بیان کی ہے، جس کا تقاضا یہ تھا کہ حمل کی زیادہ سے زیادہ مدت اڑھائی سال اور مدتِ رضاعت بھی اڑھائی سال، یعنی ہر ایک کے لیے تیس ماہ کی مدت ہوئی **كالأجل المضروب للمدينين** . لیکن حمل کی مدت میں کم لانے والی دلیل قائم ہو گئی ہے، لہٰذا آیت کا مطلب یہ ہوا کہ حمل کی زیادہ سے زیادہ مدت دو سال اور دودھ چھڑانے کی مدت اڑھائی سال ہوئی۔

(المبسوط: ۳۷۵/٦، الهداية: ۲۲۳/۱)

تبصرہ: ① دارالعلوم دیوبند کے ''شیخ الحدیث'' جناب انور شاہ کشمیری حیاتی دیوبندی صاحب کہتے ہیں: **وما أجاب به صاحب الهداية ههنا ، فهو ركيك جدّا .**
''صاحبِ ہدایہ نے یہاں جو جواب دیا ہے، وہ نہایت ہی کمزور ہے۔''

(فیض الباری شرح صحیح بخاری از انور شاہ کشمیری: ۲۷۸/٤)

② نیز لکھتے ہیں: **وردّ ابن الهمّام ما قال صاحب الهداية ، ثمّ اختار مذهب الصّاحبين .** ''ابنِ ہمام حنفی نے صاحبِ ہدایہ کی بات کا ردّ کیا ہے، پھر صاحبین (ابو یوسف و محمد بن حسن) کے مذہب کو اختیار کیا ہے۔'' (العرف الشذی از انور شاہ: ۴۹۶/۲)

③ حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ (۷۷۳۔۸۵۲ھ) اس کے ردّ میں لکھتے ہیں:
وهذا تأويل غريب . ''یہ بڑی عجیب تاویل ہے۔'' (فتح الباری: ۱٤٦/۹)

④ صاحبِ ہدایہ نے مدتِ حمل میں کمی کے متعلق جس روایت کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول ہے، آپ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

ما تزيد المرأة فى الحمل على سنتين ، قدر ما يتحوّل ظلّ المغزل .

''عورت حمل میں دو سالوں سے اتنی مقدار بھی نہیں بڑھتی، جتنا تکلے کا سایہ بدلتا ہے۔''

(سنن الدارقطنی : ۳۲۲/۳، ح : ۳۸۲۹، ۳۸۳۰، السنن الکبری للبیهقی : ٤٤٣/٧، نصب الرایة فی تخریج احادیث الهدایة للزیلعی : ۲٦٥/۳)

تبصرہ : سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ قول بلحاظِ سند ''ضعیف'' ہے، کیونکہ اس میں امام ابنِ جریج ''مدلس'' ہیں، جو کہ ''عن'' سے بیان کر رہے ہیں۔ صحیح بخاری وصحیح مسلم کے علاوہ ''ثقہ مدلس'' کی بصیغۂ ''عن'' یا ''قال''، روایات ''ضعیف'' ہوتی ہیں، تاوقتیکہ وہ سماع کی تصریح کر دے۔

اسی طرح سنن الدارقطنی (۳۸۲۲) والی سند بھی الولید بن مسلم کی ''تدلیس'' کی وجہ سے ''ضعیف'' ہے۔

جب سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول ثابت ہی نہیں تو اس کی بنیاد پر قائم ہونے والے باطل شبہات کیسے قائم رہ سکتے ہیں؟

⑤ امام ابن ابی العز الحنفی رحمہ اللہ (م۷۹۲ھ) صاحبِ ہدایہ کے اس قولِ عائشہ کے بارے میں شبہ کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

ولم يثبت ، و كيف يصحّ دعوى تنقيص المقدار الّذى دلّت عليه الآية ؟ !

''یہ روایت صحیح ثابت ہی نہیں تو جس مقدار پر آیتِ کریمہ نے دلالت کی ہے، اس کو کم کرنے کا دعویٰ کیسے صحیح ہوگا؟!''

(التنبیه علی مشکلات الهدایة لابن ابی العز الحنفی : ۱۲۷٤/۳۔۱۲۷٥)

⑥ ابنِ نجیم حنفی سے ابنِ عابدین شامی حنفی نقل کرتے ہیں:

فقد رجع (أى صاحب الهداية) إلى الحقّ فى باب ثبوت النسب من أنّ الثّلاثين لهما للحمل ستّة أشهر ، والعامان للفصال . ''نسب کے ثبوت کے باب میں صاحبِ ہدایہ حق بات کی طرف لوٹ آئے ہیں (اور کہا ہے) کہ تیس ماہ دونوں کے لیے ہیں، یعنی چھ ماہ

حمل کے لیے اور دو سال دودھ چھڑانے کے لیے (نہ کہ ہر ایک کے لیے تیس ماہ ہیں)۔''

(فتاوی شامی لابن عابدین : ۲۱۱/۳)

جن الفاظ سے ایک جگہ زیادہ سے زیادہ مدتِ حمل ثابت کی گئی، انہی سے دوسری جگہ کم از کم مدتِ حمل بھی ثابت کی گئی ہے۔ یہ کیا تضاد ہے؟ محض اپنے امام کے کمزور مذہب کو کچھ سہارا دینے کے لیے جو کہ قرآنی نص کے صریح مخالف ہے۔ امام کا مذہب ہاتھ سے نہ جائے، خواہ مخالفتِ حق ہی لازم کیوں نہ آئے! کیا یہی انصاف ہے؟

⑦ **کأجل المضروب للمدینین** کی صورت یہ بیان کی جاتی ہے کہ کوئی قرض دینے والا کہے کہ میں نے فلاں اور فلاں کو دو سال کے لیے قرض دیا ہے۔ اس سے سمجھا جائے گا کہ ہر ایک کے لیے دو سال کی مدت مقرر کی گئی ہے۔ کسی کی مدت دو سال سے کم نہیں، اسی طرح فرمانِ باری تعالیٰ: ﴿ **وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلاثُوْنَ شَهْرًا** ﴾(الاحقاف : ۱۵/٤٦) سے ہر ایک کے لیے اڑھائی سال کی مدت بیان ہوئی ہے اور حمل کی مدت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے اثر کی وجہ سے دو سال قرار پائے گی۔

تبصرہ : سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے قول کی سند ''ضعیف'' ہے، لہٰذا اس سے حمل کی مدت میں کمی کر کے دو سال مدتِ حمل قرار دینا صحیح نہیں، لہٰذا **کالأجل المضروب للمدینین** والی کہانی ختم ہوئی۔

امام ابنِ ابی العز الحنفی رحمہ اللہ (م۷۹۲ھ) لکھتے ہیں:

وفی التنظیر بالأجل المضروب للمدینین نظر ، فإنّ الأجل المضروب للمدینین غیر الأجل المضروب لأمرین یکون أحدھما بعد الآخر ، وإنّما نظیرہ أن لو قیل : زمن الصّبا والشّبوبیّة ثلاثون سنة ، ثمّ یدخل زمن الکھولة ، ومثله یکون التّقدیر لھما ، لا لکلّ منھما ، وقوله تعالیٰ : ﴿ وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلاثُوْنَ شَهْرًا ﴾ (الاحقاف : ۱۵/٤٦)، **قد استدلّ به علی أنّ أقلّ مدّة الحمل ستّة أشھر ، لأنّ اللّٰه تعالیٰ قال : ﴿ وَفِصَالُهُ فِیْ عَامَیْنِ ﴾ ، فیبقی للحمل ستّة أشھر ، فلم یکن ھذا نظیر الأجل المضروب للمدینین ، وأبو حنیفة ممّن یوافق علی تقدیر أقلّ مدّة الحمل بستّة أشھر ، وأخذ التّقدیر من ھاتین الآیتین ، فظھرت قوّة قول أبی یوسف ومحمّد**

رحمهما الله ، ولا يقاوم هذا المعنى الضّعيف قوله تعالىٰ : ﴿ وَفِصَالُهُ فِيْ عَامَيْنِ ﴾ . وقوله تعالىٰ : ﴿ وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ﴾ (البقرة : ٢٣٣/٢) ، وماذا بعد التّمام ؟

”الأجل المضروب للمدينين کی مثال (حمل اور دودھ چھڑانے کے ساتھ دینے) میں اعتراض ہے، کیونکہ یہ مثال ان دو معاملوں کی مثال نہیں بن سکتی، جن میں سے ایک دوسرے کے بعد ہو، اس کی مثال تو ایسے ہے کہ بچپن اور جوانی کا زمانہ تیس سال ہے، پھر کہولت کا زمانہ داخل ہو جاتا ہے، اس جیسی مثال میں اندازہ دونوں کے لیے ہوتا ہے، نہ کہ دونوں میں سے ہر ایک کے لیے اور اس فرمانِ باری تعالیٰ: ﴿ وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُوْنَ شَهْرًا ﴾ (الاحقاف : ١٥/٤٦) سے استدلال کیا گیا ہے کہ کم از کم مدتِ حمل چھ ماہ ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَفِصَالُهُ فِيْ عَامَيْنِ ﴾ (لقمان : ١٤/٣١)، چنانچہ حمل کے لیے چھ ماہ باقی رہ گئے، لہٰذا یہ الأجل المضروب للمدينين کی مثال نہیں ہے۔ امام ابوحنیفہ ان لوگوں میں سے ہیں، جو حمل کی کم از کم مدت چھ ماہ ہونے میں (زیادہ سے زیادہ مدتِ رضاعت دو سال کے قائلین سے) موافقت رکھتے ہیں اور انہوں نے یہ مدت انہی دو آیات سے اخذ کی ہے، لہٰذا امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ کے قول (زیادہ سے زیادہ مدتِ رضاعت دو سال) کا راجح ہونا واضح ہو گیا ہے۔

یہ کمزور توجیہ (امام ابوحنیفہ کی طرف سے کی گئی تاویل) اس فرمانِ باری تعالیٰ کا مقابلہ نہیں کر سکتا کہ: ﴿ وَفِصَالُهُ فِيْ عَامَيْنِ ﴾ (اس کے دودھ چھڑانے کا عرصہ دو سال کے اندر اندر ہے)، نیز فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ ﴾ (البقرة : ٢٣٣/٢) (مائیں اپنی اولادوں کو دو پورے سال دودھ پلائیں، یہ ان والدین کے لیے ہے، جو رضاعت کو مکمل کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں) مکمل ہو جانے کے بعد بھلا کیا رہ جاتا ہے؟

(التنبيه على مشكلات الهداية : ١٢٧٥/٣ـ١٢٧٦)

⑧ بعض الناس نے وَحَمْلُهُ کا مطلب ”گود میں اُٹھانا“ بیان کیا ہے۔ یہ امتِ مسلمہ کے فہم کے ساتھ استہزاء اور سنگین مذاق ہے، نیز قرآنِ کریم کے ساتھ کھیل تماشہ ہے اور اجماعِ صحابہ کے خلاف سازش ہے۔ اس آیتِ کریمہ کے بارے میں بعض الناس کی ساری کی ساری

تلبیسات کے جوابات مکمل ہو گئے ہیں۔ **والحمد للّٰہ !**

دلیل نمبر ③ : اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ **وَفِصَالُهُ فِيْ عَامَيْنِ** ﴾ (لقمان : ١٤/٣١)

''اس (بچے) کو دودھ چھڑانے کا عمل دو سالوں کے اندر اندر ہے۔''

یہ آیتِ کریمہ نص ہے کہ مدتِ رضاعت دو سال ہے۔

شبیر احمد عثمانی دیوبندی صاحب اس آیتِ کریمہ کے تحت لکھتے ہیں:

''امام ابوحنیفہؒ جو اکثر مدت ڈھائی سال بتاتے ہیں، ان کے پاس کوئی اور دلیل ہوگی۔ جمہور کے نزدیک دو ہی سال ہیں۔'' (تفسیر عثمانی : ٥٤٨)

ہم دیوبندیوں سے پوچھتے ہیں کہ ''کوئی اور دلیل'' کہاں ہے؟ حقیقت میں بات وہی ہے، جو عبدالحیٔ لکھنوی حنفی صاحب نے بیان کردی ہے کہ **ولیس أمرا ثابتًا بالنّصّ** ، یعنی اڑھائی سال کے بارے میں امام ابوحنیفہ کا قول کسی نص سے ثابت نہیں ہے، بلکہ نصِ قرآنی کے خلاف ہے۔ ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ قرآنِ مجید نے کامل مدتِ رضاعت دو سال بیان کی ہے۔ امام ابوحنیفہ کے دو شاگرد امام ابو یوسف اور امام محمد بن حسن شیبانی کا مذہب بھی یہی ہے کہ مدتِ رضاعت دو سال ہے۔

ابنِ نجیم حنفی نے لکھ دیا ہے کہ : **ولا یخفیٰ قوّۃ دلیلھما ...**

''ان دونوں (ابو یوسف و محمد بن حسن) کی دلیل کی قوت مخفی نہیں ہے۔''

(البحر الرائق لابن نجیم الحنفی : ٢٣٩/٣)

فقہ حنفی کا مفتیٰ بہ قول بھی یہی ہے۔

لیکن افسوس ہے ان بعض لوگوں پر جو اتنی صراحت کے باوجود اپنے امام کے بے دلیل مذہب کو ثابت کرنے کی ناکام کوشش میں قرآنِ مجید میں تحریفِ معنوی کے مرتکب ہو رہے ہیں!

آخر میں علامہ عبدالحیٔ لکھنوی حنفی کا حقیقت پر مبنی قول ذکر کیے دیتے ہیں:

وبالجملة ، فکلّ ما استدلّوا لإثبات مذهبه باطل .

''حاصل کلام یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ کے مذہب کے ثبوت پر حنفی فقہاء نے جو استدلالات کیے ہیں، وہ سارے کے سارے باطل ہیں۔'' (عمدة الرعاية فی شرح الوقاية : ٢٠٦/٣)

❀❀❀❀❀❀❀

اعتذار : شمارہ نمبر ⑱ ، صفحہ نمبر ۳۰ ، سطر نمبر ۷ میں کمپوزنگ کی غلطی سے ''یقیناً ہر مسلمان کا جواب نفی میں ہوگا'' کی بجائے ''یقیناً ہر مسلمان کا جواب ہاں میں ہوگا'' شائع ہوگیا ہے۔ قارئین درستی فرمالیں۔

توضیح : گذشتہ شمارہ میں ''اہل سنت کون؟'' کے تحت امام عبدالوہاب رحمہ اللہ کے عقیدہ کے تذکرہ میں لکھا گیا تھا کہ وہ فرماتے ہیں: ''میں اولیائے کرام کی کرامات و مکاشفات کا بھی اقراری ہوں۔۔۔'' اس سے مراد کوئی گمراہ صوفیوں کی اصطلاحی کرامات و مکاشفات نہ سمجھ لے، بلکہ اہل سنت جن کرامات و مکاشفات کے اقراری ہیں، ان میں کرامات سے مراد وہ خارقِ عادت کام ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ کبھی کسی ولی کے ہاتھ پر ظاہر کردیتا ہے، لیکن وہ اس کا اختیار نہیں رکھتے۔ اسی طرح مکاشفات سے مراد وہ فہم و فراست ہے، جو باقی لوگوں کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ اپنے اولیاء کو کسی معاملہ میں دے دیتا ہے، گویا کہ وہ معاملہ ان پر کھل جاتا ہے، لیکن وہ اس کے بھی مالک نہیں ہوتے کہ جب چاہیں ایسا سمجھ لیں، نہ ہی وقوع سے پہلے اس پر وہ قطعی یقین کرسکتے ہیں کہ یہ علمِ غیب کہلا سکے۔

❀❀❀❀❀❀❀

شیخ الاسلام ابن تیمیہ (٦٦١۔٧٢٨ھ) مقلد نہیں تھے۔

''اہل سنت میں سے اس بات کا کوئی بھی قائل نہیں کہ ائمہ اربعہ کا اجماع معصوم حجت ہے اور نہ کسی نے کہا ہے کہ حق اس میں منحصر ہے اور جو اس سے خارج ہو، وہ باطل ہے، بلکہ جب کوئی امام سفیان ثوری، امام اوزاعی، امام لیث بن سعد اور ان سے پہلے کے مجتہدین، جو ائمہ اربعہ کے پیروکاروں میں سے نہیں ہیں، ان میں سے کوئی شخص کوئی ایسا قول کہے، جو ائمہ اربعہ کے قول کے خلاف ہو تو جس چیز میں ان کا تنازع ہوگا، اسے اللہ و رسول کی طرف لوٹایا جائے گا اور راجح قول وہی ہوگا، جس پر دلیل قائم ہوجائے گی۔''(منهاج السنة لابن تيمية : ٤١٢/٣)

دفاعِ حدیث — صحیح بخاری کا مطالعہ اور فتنۂ انکارِ حدیث — حافظ ابو یحییٰ نور پوری

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی منقبت میں حدیثِ براء بن عازب رضی اللہ عنہ
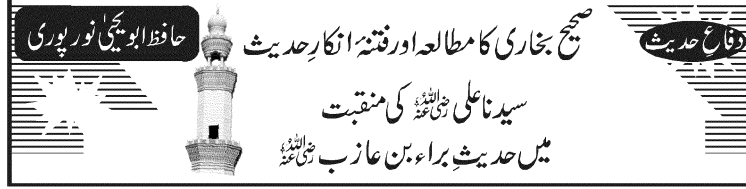
اعتراض نمبر ② : ''پس بخاری کی روایت کے مطابق عبیداللہ بن موسیٰ کی بیان کردہ یہ حدیث تین حدیثوں پر مشتمل ہے۔(۱) صلح حدیبیہ کا قصہ (۲) جب حضور ﷺ مکہ سے روانہ ہوئے تو حمزہ کی بیٹی کا یا عمّ ، یا عمّ پکارتے ہوئے آپ کے پیچھے لگ جانا۔۔۔ (۳) حضرت علی کا آپ سے درخواست کرنا کہ حمزہ کی بیٹی کو اپنی زوجیت میں لے لیں اور آپ کا یہ فرمانا کہ رضاعی رشتہ سے میری بھتیجی ہونے کی وجہ سے وہ میرے لیے جائز نہیں ہے۔

عبیداللہ بن موسیٰ نے یہ تینوں حدیثیں بخاری کو ایک ہی سیاق وسند کے ساتھ سنائی تھیں ، جس سے بخاری نے سمجھ لیا کہ تینوں قصوں پر مشتمل یہ ایک ہی حدیث ہے ، جو براء بن عازب صحابی سے مروی ہے۔ اور امام بخاری کے علاوہ محمد بن سعد اور حافظ احمد بن حازم بن ابی غرزہ غفاری نے بھی عبیداللہ بن موسیٰ سے یہ حدیث روایت کی ہے ، مگر ان دونوں کی روایت میں صلح حدیبیہ کا قصہ نہیں ہے۔۔۔ اور عبیداللہ بن موسیٰ کے علاوہ اسرائیل بن یونس سے یہ حدیث اسود بن عامر ، یحییٰ بن آدم ، حجاج بن محمد اور اسماعیل بن جعفر نے بھی روایت کی ہے۔ ان میں سے کسی کی روایت میں صلح حدیبیہ کا قصہ نہیں ، صرف حمزہ کی بیٹی کا قصہ مذکور ہے۔۔۔

پس اسرائیل کے اس حدیث میں پانچ تلامذہ ہیں : ① اسود بن عامر ② یحییٰ بن آدم ③ حجاج بن محمد ④ اسماعیل بن جعفر اور ⑤ عبیداللہ بن موسیٰ۔

اوّل الذکر چار اشخاص کی روایت میں بس دخترِ حمزہ کا ذکر ہے ، صلح حدیبیہ کا نہیں اور ان کی اسناد بتاتی ہے کہ ابو اسحاق کو دخترِ حمزہ کا یہ قصہ ہبیرہ بن یریم اور ہانی بن ہانی سے معلوم ہوا تھا اور یہ دونوں شخص غیر ثقہ ، ضعیف ومجروح اور رافضی ہیں ۔ دونوں نے متعدد اناپ شناپ باتیں حضرت علی کی طرف منسوب کر کے لوگوں میں پھیلانے کا جرم کیا تھا۔ عبیداللہ بن موسیٰ نے اپنے رفض وبداعتقادی کو زہد اور تقیہ کے ذریعہ چھپانے کی بلیغ کوشش کی تھی اور وہ اس بات سے واقف تھا کہ اہل علم ہبیرہ بن یریم اور ہانی بن ہانی کو غیر ثقہ سمجھتے ہیں ، مگر ان کی روایت میں مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی سے

أنت منّي و أنا منك (تو مجھ سے اور میں تجھ سے ہوں) فرمایا تھا۔ عبیداللہ نے اسے صحیح ثابت کرنے کی غرض سے دو طرح کی تلبیس کی تھی۔ ایک یہ ہبیرہ اور ہانی کے ساتھ حضرت براء بن عازب کا بھی ذکر کر دیا، چنانچہ اس نے محمد بن سعد کو یہی بتایا تھا کہ ابواسحاق نے یہ دختر حمزہ کا قصہ حضرت براء بن عازب سے بھی روایت کیا ہے اور ہبیرہ بن یریم اور ہانی سے بھی اور ان دونوں (ہبیرہ و ہانی) نے حضرت علی سے۔ مقصد یہ تھا کہ ہبیرہ و ہانی کے ضعیف و غیر ثقہ ہونے کو نظر انداز کر دیا جائے۔ یہ سمجھ کر کہ جو بات ان دو ضعیف شخصوں نے بیان کی ہے، وہی حضرت براء بن عازب صحابی نے بھی بیان کی ہے۔ دوم یہ کہ اسناد سے ہبیرہ و ہانی کا نام ہی سرے سے حذف کر دیا اور ابواسحاق نے حضرت براء بن عازب سے صلح حدیبیہ کے متعلق جو حدیث روایت کی ہے اور ابواسحاق نے ہبیرہ و ہانی سے دختر حمزہ کے متعلق جو حدیث روایت کی ہے، دونوں کو ملا کر ایک حدیث براء بن عازب کی بیان کردہ حدیث بنا دیا۔ امام بخاری کو عبیداللہ نے یہی دھوکا دیا تھا۔

امام بخاری کے علم میں اسرائیل بن یونس کے دیگر تلامذہ کی روایات آ گئی ہوتیں تو شاید وہ یہ دھوکا نہ کھاتے اور زکریا بن ابی زائدہ کی روایت نے تو عبیداللہ بن موسیٰ کی تلبیس کا پردہ چاک کر دیا ہے۔ یحییٰ بن زکریا بن ابی زائدہ کہتے ہیں: **حدّثنا أبي وغيره عن أبي اسحاق عن البراء بن عــازب ...** اس روایت سے روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ ابواسحاق نے دخترِ حمزہ کا قصہ ہبیرہ بن یریم و ہانی بن ہانی سے سنا تھا نہ کہ براء بن عازب سے اور عبیداللہ بن موسیٰ عبسی نے فریب دینے کی خاطر جھوٹ بول کر اُسے براء بن عازب کی طرف منسوب کر دیا تھا اور عبیداللہ بن موسیٰ کی بیان کردہ یہ حدیث صحیح بخاری میں جگہ پانے کے لائق نہ تھی۔''

(«صحیح بخاری کا مطالعہ» : ۱/۶۷-۷۰)

(جواب) : ① قارئین کرام! میرٹھی صاحب کے اس دعویٰ کو آپ دوبارہ پڑھ لیں کہ اسرائیل کے اس حدیث میں پانچ اساتذہ ہیں اور اسرائیل بن یونس سے صلح حدیبیہ والا واقعہ صرف عبیداللہ بن موسیٰ نے بیان کیا ہے، کسی اور راوی نے نہیں۔

لیکن یہ دونوں باتیں سفید جھوٹ ہیں۔ پہلی بات یوں کہ اس حدیث میں اسرائیل کے صرف پانچ نہیں ہیں، بلکہ منکرینِ حدیث اگر انکارِ حدیث کی عینک اتار کر کتبِ احادیث کا مطالعہ کرتے تو

انہیں اسرائیل کے دو اور شاگرد حجین بن مثنیٰ اور محمد بن یوسف فریابی، مسند احمد (٢٩٨/٤) اور سنن دارمی (٢٥٠٧) میں نظر آ جاتے۔ دوسری بات کہ اسرائیل بن یونس سے صلح حدیبیہ والا قصہ صرف عبیداللہ بن موسیٰ نے بیان کیا ہے، یوں جھوٹ ہے کہ مذکورہ دونوں شاگردوں نے اسرائیل بن یونس سے صلح حدیبیہ والا قصہ ہی بیان کیا ہے۔ اب تو کوئی شبہ نہیں رہا کہ میرٹھی صاحب کا عبیداللہ بن موسیٰ پر اعتراض فضول ہے۔

اور یہاں ایک مزے کی بات آپ کو بتاتے چلیں کہ میرٹھی صاحب کو اس اعتراض کے بعد معلوم ہو گیا تھا کہ اسرائیل کے اس حدیث میں دو اور شاگرد بھی موجود ہیں اور وہ یہی صلح حدیبیہ والا قصہ بیان کرتے ہیں، جیسا کہ انہوں نے اس کا تذکرہ بھی کیا ہے۔(«صحیح بخاری کا مطالعه» : ٧٤/١)

لیکن افسوس کہ انہوں نے اپنی اس صریح غلط بیانی کو جانتے بوجھتے برقرار رکھا ہے۔ اس سے رجوع کر کے اسے اپنی کتاب سے خارج کرنے کی ہمت نہیں کر سکے۔

② میرٹھی صاحب کا ہبیرہ بن یریم اور ہانی بن ہانی کو غیر ثقہ، ضعیف اور مجروح قرار دینا بھی جھوٹ ہے، کیونکہ:

(۱) ہبیرہ بن یریم کے بارے میں امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

لا بأس بحديثه ، هو أحسن استقامة من غيره . ''اس کی حدیث میں کوئی حرج نہیں ہے۔ وہ اپنے علاوہ دوسرے راویوں سے بہتر استقامت والا ہے۔

(الجرح والتعديل لابن ابی حاتم : ١٠٩/٩، وسندهٗ صحيحٌ)

امام ابنِ عدی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: **وأرجوا أن لا بأس به .** ''اور مجھے امید ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔'' (الكامل فی ضعفاء الرجال لابن عدی : ١٣٣/٧)

امام عجلی رحمہ اللہ اسے ثقہ قرار دیتے ہیں۔ (معرفة الثقات للعجلی : ١٨٨٥)

امامِ ترمذی رحمہ اللہ نے اس کی حدیث کو ''حسن صحیح'' کہا ہے (جامع الترمذی : ٧٩٥، ٢٨٠٨)، جو کہ اصولِ محدثین کے مطابق اس کی توثیق کو مستلزم ہے۔

امام ابنِ حبان رحمہ اللہ نے بھی اسے اپنی کتاب الثّقات میں ذکر کر کے ثقہ قرار دیا ہے۔

(الثقات لابن حبان : ٥٩٨٩)

امام نسائی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: **أرجوا أن لا یکون به بأس ، ویحییٰ وعبد الرّحمن لم یتر کا حدیثه . . .** ''میں امید کرتا ہوں کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔امام یحیٰی (بن سعید القطان) اور عبدالرحمٰن (بن مہدی) نے اس کی حدیث کو نہیں چھوڑا۔''

(تهذیب التهذیب لابن حجر : ۲۳/۱۱)

امام حاکم رحمہ اللہ نے اس کی حدیث کو بخاری ومسلم کی شرط پر ''صحیح'' قرار دیا ہے۔(المستدرك علی الصحیحین للحاکم : ۳۷۷۳، ۸۰۰۳)، نیز اس کی سند کو ''صحیح'' بھی کہا ہے(٦٤١٤)،حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے ان کی موافقت کی ہے۔

علامہ ہیثمی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: **وهو ثقة .** ''وہ ثقہ ہیں۔''

(مجمع الزوائد : ۲۰۸/۳، ۲۰۳/۵، ۲۹۷)

سب اقوال کو مدِّنظر رکھ کر حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ کا اس کے بارے میں فیصلہ یہ ہے کہ:

لا بأس به ، وقد عیب بالتّشیّع . ''اس میں کوئی حرج نہیں ، اس میں شیعہ ہونے کا عیب بیان کیا گیا ہے۔''(تقریب التهذیب لابن حجر : ۷۲٦۸)

یہ وضاحت تو ہم قارئین کرام کی نظر کر ہی چکے ہیں کہ محض شیعہ (سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ پر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت کا قائل) ہونا محدثین کی نظر میں حدیث میں کسی ضعف کا سبب نہیں بنتا۔

عبدالرحمٰن بن یوسف بن خراش کا اس راوی کو ''ضعیف'' قرار دینا کوئی حیثیت نہیں رکھتا، کیونکہ خود ابنِ خراش رافضی خبیث تھا۔(لسان المیزان لابن حجر : ٤٤٤/۳)

میرٹھی صاحب کے معتقدین کسی محدث سے ہبیرہ بن یریم کو ''رافضی'' کہنا ثابت نہیں کر سکتے!

اب قارئین کرام ہی بتائیں کہ اقوالِ محدثین سے بالکل بے خبر ہو کر ہبیرہ بن یریم کو بلا دلیل غیر ثقہ، ضعیف ومجروح اور رافضی کہنے والے میرٹھی صاحب کی بات مانی جائے گی یا اقوالِ محدثین کے مطابق فیصلہ کر کے ہبیرہ بن یریم کو قابل اعتبار کہنے والے، ماہرِ فن علامہ ہیثمی رحمہ اللہ اور حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ کی؟ فیصلہ خود کریں!

(۲) ہانی بن ہانی کے بارے میں امام نسائی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: **لیس به بأس .** ''اس میں کوئی عیب نہیں۔''(تهذیب التهذیب لابن حجر : ۲۲/۱۱)

امام عجلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کوفيّ ، تابعيّ ، ثقة . ''کوفہ کے رہنے والے تابعی ہیں۔ثقہ (قابل اعتبار) آدمی تھے۔''(معرفة الثقات : ۱۸۸۳)

امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس کی حدیث کو''حسن صحیح'' کہا ہے، جو کہ اصولِ محدثین کے مطابق اس کی توثیق کو مستلزم ہے۔(جامع الترمذی : ۳۷۷۹، ۳۷۹۸)

امام الضیاء المقدسی رحمہ اللہ نے بھی اس کی حدیث کو صحیح قرار دے کر اس کی توثیق کی ہے۔

(الاحادیث المختارة للضیاء المقدسی : ۷۸۸،۷۹۱)

امام ابنِ حبان رحمہ اللہ بھی اس کو ثقہ قرار دیتے ہیں۔(الثقات لابن حبان : ۵۹۷۹)

امام حاکم رحمہ اللہ نے اس کی حدیث کو''صحیح الاسناد'' قرار دیا ہے۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے ان کی موافقت کی ہے۔(المستدرك علی الصحیحین للحاکم : ٤٧٧٣، ٤٧٨٣)

علامہ ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وهو ثقة . ''وہ ثقہ ہے۔''(مجمع الزوائد : ۱۰۲/۸)

علامہ ذہبی رحمہ اللہ کے نزدیک بھی یہ راوی''حسن الحدیث'' ہے۔(الکاشف للذهبی : ۵۹۳۸)

امام ابن مدینی رحمہ اللہ کا اسے''مجہول'' اور امام ابنِ سعد رحمہ اللہ کا اسے''منکر الحدیث'' کہنا جمہور کی توثیق کے مقابلے میں قابل التفات نہیں ہے۔

آج تک کسی ناقدِ رجال محدث نے ہانی بن ہانی کو''رافضی'' نہیں کہا۔اگر میرٹھی صاحب کی کسی معتقد میں ہمت ہے تو آزمائے!

اب قارئین کرام ہی بتائیں کہ راویانِ حدیث کے بارے میں بات ائمہ حدیث اور محدثین کی مانی جائے گی یا میرٹھی صاحب کی؟

③ ہم پوری وضاحت سے ثابت کر چکے ہیں کہ عبید اللہ بن موسیٰ کو رافضی و بدعقیدہ کہنا میرٹھی صاحب کی اپنی بدعقیدگی اور تلبیس وعیاری کی بدترین مثال ہے۔

نیز یہ بات بھی میرٹھی صاحب کے اعتراف کے ساتھ مکمل طور پر واضح ہوچکی ہے کہ صرف عبید اللہ بن موسیٰ نے ہی اس طرح روایت بیان نہیں کی، بلکہ دو اور راوی بھی صلح حدیبیہ والا قصہ اسرائیل سے بیان کرتے ہیں، لہٰذا اسے عبید اللہ بن موسیٰ کی تلبیس ، دھوکا دہی اور عیاری کہنا بجائے خود ابلیسی ہتھکنڈا، بہت بڑا افراڈ اور شیطان کی یاری ہے!

④ زکریا بن ابی زائدہ کی اس روایت نے تو الٹا میرٹھی صاحب کی تلبیس کا پردہ چاک کیا ہے، کیونکہ انہوں نے ابواسحاق کی سند سے صلح حدیبیہ اور دخترِ حمزہ دونوں کا قصہ بیان کیا ہے اور وہ سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے ہی بیان کررہے ہیں۔ یہ تو اس بات کی زبردست دلیل ہے کہ اس پر عبیداللہ بن موسیٰ کی وجہ سے اعتراض کرنا انتہائی فضول ہے اور عبیداللہ بن موسیٰ عبسی کی یہ حدیث صحیح بخاری میں جگہ پانے کے بالکل قابل تھی۔

ہاں! البتہ میرٹھی صاحب کی علمی اور عقلی قابلیت امتِ مسلمہ کے اتفاقی فیصلے صحیح بخاری پر اعتراض کرنے کے قابل نہیں تھی۔

⑤ سچ ہے کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے، وہ ایک صورت میں قائم نہیں رہ سکتا، بلکہ ہمیشہ شکل بدلتا ہی رہتا ہے۔ میرٹھی صاحب نے ابواسحاق کی حدیثِ تحویل قبلہ پر ابواسحاق کے اختلاط کا اعتراض کیا تھا، لیکن اب ''دروغ گورا حافظہ نہ باشد'' کی عملی تصویر بن کر اس کا نام تک نہیں لیا، بلکہ عبیداللہ بن موسیٰ، ہبیرہ بن یریم اور ہانی بن ہانی پر بلا دلیل طبع آزمائی کر کے اس حدیث کو ''ضعیف'' قرار دینے کی کوشش میں ہیں۔

حدیثِ تحویل قبلہ میں بھی ابواسحاق کے ایک شاگرد اسرائیل بن یونس تھے، جن کے بارے میں میرٹھی صاحب کا اصرار تھا کہ انہوں نے ابواسحاق سے اختلاط کے بعد احادیث سنی تھیں، لیکن ہم نے بفضل اللہ ایک درجن محدثین سے ان کا اختلاط سے قبل سننا ثابت کیا تھا۔ اب وہی اسرائیل یہاں اسی ابواسحاق سے بیان کررہے ہیں، مگر میرٹھی صاحب نے ان کا نام تک نہیں لیا۔ معلوم ہوا کہ میرٹھی صاحب کا وہ اعتراض جاہلانہ تھا۔ اگر ابواسحاق کے اختلاط والا اعتراض کوئی علمی حیثیت رکھتا ہوتا تو وہ یہاں بھی اسے ضرور ذکر کرتے! وہاں اگر یہ حدیث کے ''ضعف'' کا سبب تھا تو یہاں کیوں نہیں؟

قارئین کرام! اللہ سے ڈر کر فیصلہ کریں کہ حق کس کے ساتھ ہے؟ امام بخاری رحمہ اللہ، پوری امتِ مسلمہ اور صحیح بخاری کا دفاع کرنے والوں کے ساتھ یا محدثین اور پوری امتِ مسلمہ کے اتفاقی فیصلے صحیح بخاری اور پر بلا دلیل اعتراض کرنے والے منکرینِ حدیث کے ساتھ؟

فائدہ : صحیح بخاری و صحیح مسلم کے علاوہ دوسری کتبِ حدیث میں اس حدیث کی دو سندوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بشارت سن کر سیدنا علی رضی اللہ عنہ، سیدنا زید اور سیدنا جعفر کے ناچنے کا ذکر

ہے۔(مسند الامام احمد : ۱۰۸/۱، السنن الکبرٰی للبیھقی : ۶/۸)

اس کی تین سندیں ہیں، ایک مسند احمد میں اور دو بیہقی میں، لیکن یہ سب کی سب ''ضعیف'' ہیں۔

امام احمد رحمہ اللہ والی سند ابواسحاق السبیعی کی ''تدلیس'' کی بنا پر ''ضعیف'' ہے۔ امام بیہقی رحمہ اللہ نے اس کی دو سندیں پیش کی ہیں۔ پہلی سند (۸/۵۔۶) میں اگرچہ ابواسحاق السبیعی نے سماع کی تصریح کی ہے، مگر اس سند کا ایک راوی عبداللہ بن محمد (بن سعید) بن ابی مریم سخت ''ضعیف'' ہے۔

امام ابنِ عدی رحمہ اللہ اس کے بارے میں فرماتے ہیں: **عبد اللّٰه بن محمّد بن سعيد بن أبي مريم مصريّ ، يحدّث عن الفريابيّ وغيره بالبواطيل ...**

''عبداللہ بن محمد بن سعید بن ابی مریم مصری ہے۔ یہ فریابی وغیرہ سے باطل روایات بیان کرتا ہے۔''

نیز لکھتے ہیں: **وعبد اللّٰه بن محمّد بن سعيد بن أبي مريم هذا إمّا أن يكون مغفّلا لا يدري ما يخرج من رأسه أو يتعمّد ، فإنّي رأيت له غير حديث ممّا لم أذكره أيضا هاهنا غير محفوظ .** ''یہ عبداللہ بن محمد بن سعید بن ابی مریم راوی یا تو اتنا غیر حاضر دماغ تھا کہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ اس کے سر سے کیا نکل رہا ہے یا پھر یہ جان بوجھ کر جھوٹ بولتا تھا، کیونکہ میں نے جو احادیث یہاں ذکر نہیں کیں، ان میں بھی اس کی کئی غیر محفوظ احادیث دیکھی ہیں۔''

(الکامل فی ضعفاء الرجال لابن عدی : ۲۵۵/۴)

علامہ ہیثمی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: **وهو ضعيف جدّا .** ''یہ سخت ضعیف راوی ہے۔''(مجمع الزوائد : ۳۸۹/۲)

اس میں دوسری علت یہ ہے کہ ابواسحاق السبیعی ''مختلط'' ہیں، ان سے بیان کرنے والے راوی زکریا بن ابی زائدہ ہیں، جو کہ ان سے اختلاط کے بعد بیان کرتے ہیں۔

اور دوسری سند (۲۶۶/۱۰) میں ان سے اختلاط سے پہلے بیان کرنے والے راوی اسرائیل بن یونس بیان کرتے ہیں، لیکن وہاں ابواسحاق ''عن'' سے بیان کر رہے ہیں اور وہ ''مدلس'' بھی ہیں، لہٰذا یہ واقعہ تمام سندوں سے مردود ہے۔ **والحمد لله !**

اعتراض نمبر ③ : ''اس حدیث کے مضامین کا جائزہ'' کی سرخی جما کر میرٹھی صاحب لکھتے ہیں: ''عبیداللہ کی بیان کردہ حدیث تین قصوں پر مشتمل ہے۔

پہلا قصہ صلح حدیبیہ کا ہے، جو جھوٹ اور سچ اور صحیح وغلط کا ملغوبہ ہے۔ اس روایت میں جو کمیاں اور غلط بیانیاں ہیں، اس کے ترجمہ میں جگہ جگہ بین القوسین میں نے ان کی تصحیح کردی ہے۔ ان غلط بیانیوں کی تفصیل یہ ہے:

(۱) عبیداللہ بن موسیٰ کی اس حدیث میں ہے: **حتی قاضاهم علیّ أن یقیم بها ثلاثة أیّام .** اس سے یہی مفہوم ہوتا ہے کہ حدیبیہ میں کہن سنن کے بعد نبی ﷺ نے اہل مکہ سے اسی سال کے لیے مکہ مکرمہ میں داخل ہونے کی بات طے کرلی تھی، بشرطیکہ تین دن سے زائد قیام نہ کریں۔ اور پرتلوں میں تلواروں کے علاوہ اور ہتھیار لے کر داخل نہ ہوں اور اہل مکہ میں سے کوئی ساتھ جانا چاہے تو اسے نہ روکیں۔ آپ نے یہ شرطیں منظور فرمالیں اور مع اصحاب مکہ تشریف لے گئے۔ تین دن مکہ میں رہے۔ اہل مکہ نے حضرت علی سے کہا کہ اپنے صاحب سے کہدو کہ مدت پوری ہوگئی، لہٰذا یہاں سے چلے جائیں۔ آپ نے ان کی بات مان لی اور مکہ سے نکل گئے۔

یقیناً یہ بات غلط ہے۔ مکہ والوں سے تو حضور ﷺ نے دس سال تک کے لیے ناجنگی کا معاہدہ کیا تھا۔ اس کے لیے انہوں نے متعدد شرطیں رکھی تھیں۔ ان میں سے ایک اہم شرط یہ تھی کہ اس سال اہل اسلام یہیں سے واپس چلے جائیں۔ آئندہ سال آسکتے ہیں۔ آپ نے انہیں ہر طرح سمجھایا کہ ہم لڑائی کی غرض سے نہیں آئے، ہم تو خانۂ کعبہ کی زیارت کرنا اور لائے ہوئے جانوروں کی قربانی کرنا چاہتے ہیں، عمرہ ادا کرتے ہی واپس ہوجائیں گے، لیکن مکہ والوں نے ایک نہ سنی اور کہا اگر یہ بات آپ نہیں مانتے تو ہم صلح نہیں کرسکتے اور مکہ جانے کے لیے آپ کو ہماری لاشوں پر سے گزرنا ہوگا۔ آخر آپ نے ان کی یہ شرط مان لی اور حدیبیہ میں ہی قربانیاں کرکے سر منڈوا کر احرام کھول کر واپس ہوگئے۔''

(«صحیح بخاری کا مطالعہ» : ۱/۷۲-۷۳)

جواب : ① قارئین کرام ! میرٹھی صاحب نے صحیح بخاری کے جن الفاظ سے ''مفہوم'' نکال کر اعتراض کیا ہے، ان سے ہرگز ہرگز یہ ''مفہوم'' نہیں نکلتا۔ میرٹھی صاحب کے پیش کیے ہوئے صحیح بخاری کے الفاظ اور عربی قواعد کے مطابق ان کا صحیح ترجمہ پیشِ خدمت ہے:

اعتمر النبیّ صلّی اللّٰه علیه وسلّم فی ذی القعدة ، فأبی أهل مکّة أن یدعوه یدخل مکّة حتّی قاضاهم علی أن یقیم بها ثلاثة أیّام . . .

''نبی اکرم ﷺ نے ذی قعدہ میں عمرہ (کا ارادہ) کیا۔ اہل مکہ نے آپ کو تین دن قیام کا معاہدہ کرنے تک مکہ میں داخل ہونے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔''

اب قارئین کرام ہی بتائیں کہ اس عبارت میں کون سے الفاظ ہیں، جن سے ''مفہوم ہوتا ہے'' کہ آپ ﷺ نے اسی سال مکہ میں داخل ہونے کی بات طے کر لی تھی؟ بات صرف اتنی ہے کہ مکہ والوں نے یہ کہا تھا کہ اس وقت تک مکہ میں داخلے کی اجازت نہیں دی جا سکتی، جب تک ان سے صرف تین دن قیام کا معاہدہ نہ کیا جائے۔ جب آپ ﷺ نے تین دن سے زائد قیام نہ کرنے کا معاہدہ کر لیا تو مکہ والوں نے آپ ﷺ کو مکہ میں داخلے کی اجازت دے دی تھی۔ یہ مکہ میں داخلے کے لیے ایک شرط تھی، جیسا کہ انہوں نے یہ شرط بھی لگائی تھی کہ مسلمان مکہ میں اس سال داخل نہیں ہوں گے۔

صحیح بخاری کے ان الفاظ میں ان شرطوں میں سے کسی کی بھی نفی نہیں ہے۔ یہ محض انکارِ حدیث کا پروردہ اعتراض ہے، ورنہ آج تک کسی مسلمان نے اس حدیث سے یہ بات نہیں سمجھی۔

اس کے برعکس حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: **قوله : حتّى قاضاهم على أن يقيم بها ثلاثة أيّام ، أى من العام المقبل ، وصرّح به فى حديث ابن عمر بعده ...**

''سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ کا جو قول ہے کہ آپ ﷺ نے ان سے تین دن قیام کرنے کا معاہدہ کر لیا، اس سے مراد ہے کہ اگلے سال میں۔ اس کی صراحت اس کے متصل بعد والی حدیثِ ابنِ عمر رضی اللہ عنہما میں کر دی گئی ہے۔'' (فتح الباری لابن حجر : ۵۰۲/۷)

اب قارئین کرام ہی بتائیں کہ صحیح بخاری کا درست مفہوم سمجھنے کے لیے حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ جیسے نابغۂ روزگار شارحینِ حدیث کی بات مانی جائے گی یا عربی دانی میں بالکل فیل ہونے جانے والے میرٹھی صاحب کی؟ میرٹھی صاحب کی عربی دانی کا پورا اندازہ قارئین کرام اگلے اعتراض کے جواب میں بخوبی کر لیں گے۔　　ان شاء اللہ !

② باقی رہا میرٹھی صاحب کا یہ کہنا کہ ''یہ قصہ جھوٹ اور سچ اور صحیح و غلط کا ملغوبہ ہے'' تو یہ دراصل میرٹھی صاحب کی اپنی غلط فہمی اور جہالت ہے۔ اس کی مکمل تشفی آئندہ اعتراضات کے ضمن میں ہو جائے گی۔　　ان شاء اللہ !

اعتراض نمبر ④ : ''(۲)　　عبیداللہ کی روایت میں ہے کہ

اہل مکہ نے کہا تھا: لو نعلم انک رسول اللّٰہ . **لو نعلم** عربیت کے لحاظ سے غلط ہے، صحیح لفظ **لو علمنا** ہے۔'' («صحیح بخاری کا مطالعہ»: ۷۳/۱)

(جواب) : انکار بخاری دراصل انکار قرآن ھے !

قارئین کرام! ہم جو وقتاً کہتے رہتے ہیں کہ انکارِ حدیث دراصل انکارِ قرآن ہے، وہ محض ایک لفظی جملہ نہیں ہے، بلکہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے۔ اتمامِ حجت کے لیے اس حقیقت کا اثبات اللہ تعالیٰ منکرینِ حدیث کے قلم سے کرواتے رہتے ہیں۔ میرٹھی صاحب کا مذکورہ اعتراض بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ میرٹھی صاحب نے جو اعتراض صحیح بخاری پر کیا ہے، وہی قرآنِ کریم پر بھی آ گیا ہے۔

میرٹھی صاحب کا کہنا ہے کہ **لو نعلم** عربیت کے لحاظ سے غلط ہے، صحیح لفظ **علمنا** ہے۔ گویا وہ کہنا یہ چاہتے تھے کہ **لَوْ** جو کہ عربی میں حرفِ تمنا ہے، وہ مضارع پر نہیں، بلکہ ماضی پر داخل ہوتا ہے۔ لیکن ان کی وسعتِ علمی اور عربی دانی کی داد دیجیے کہ جسے انہوں نے غلطی کہا ہے، وہ قرآنِ کریم اور حدیثِ نبوی میں بکثرت موجود ہے۔

اگرچہ **لَوْ** کا ماضی پر داخل ہونا زیادہ ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مضارع پر اس کا داخل ہونا ممتنع ہے۔ ایسا کہنا جہالت و نادانی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ قرآنِ کریم میں ہی بہت سے مقامات پر **لَوْ** مضارع پر داخل ہوا ہے۔ تسلی کے لیے مثال کے طور پر درجِ ذیل مقامات کا مشاہدہ کر لیا جائے۔

سورة البقرة (۱۶۵/۲) ، **سورة الأنعام** (۲۷/۶، ۳۰، ۹۳) ، **سورة الأنفال** (۵۰/۸) ، **سورة يونس** (۱۱/۱۰) ، **سورة النّحل** (۶۱/۱۶) ، **سورة السّجدة** (۱۲/۳۲) ، **سورة سبا** (۳۱/۳۴، ۵۱) ، **سورة فاطر** (۴۵/۳۵) ، **سورة يٰسٓ** (۶۶/۳۶، ۶۷) ، **سورة الزّخرف** (۶۰/۴۳) ، **سورة محمّد** (۴/۴۷، ۳۰) .

پھر اس پر طرہ یہ کہ جن الفاظ کو میرٹھی صاحب نے غلط کہا ہے، بالکل وہی الفاظ بعینہٖ قرآنِ کریم میں موجود ہیں۔ ہم وہ الفاظ بھی ہدیۂ قارئین کرتے ہیں تاکہ منکرینِ حدیث کوئی پس و پیش نہ کر سکیں اور ان کے پاس غلطی تسلیم کرنے کے سوائے کوئی چارہ نہ رہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ **قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّاتَّبَعْنٰكُمْ** ...﴾ (آل عمران: ۱۶۷/۳)

قارئین کرام! دیکھ لی آپ نے میرٹھی صاحب کی عربی دانی کہ جو چیز قرآنِ کریم میں بھی بکثرت

مستعمل ہے، وہ اسے بھی عربیت کے لحاظ سے غلط قرار دے رہے ہیں۔ یہ اعتراض کر کے میرٹھی صاحب نے عربی زبان سے اپنی جہالت پر قیامت تک کے لیے مہر ثبت کر دی ہے۔

اللہ کے لیے غور کریں وہ لوگ جو میرٹھی صاحب کو ''مفسر قرآن'' کے لقب سے یاد کرتے ہیں! اور غور کریں وہ لوگ جو ان کے جاہلانہ اعتراضات کی بھینٹ چڑھ کر پوری امت کے اتفاقی فیصلوں کو بھی ٹھوکر مار دیتے ہیں! کیا کسی اس قدر جاہل شخص کو اس صحیح بخاری پر اعتراضات کرنے کا حق ہے، جو خود اس کے نزدیک بھی (دیکھیں «صحیح بخاری کا مطالعہ» : ۱۵/۱) تحقیق وصحت کا شاہکار ہے؟

معلوم ہوا کہ حدیث پر، خصوصاً صحیح بخاری پر اعتراض ہٹ دھرمی، جہالت، شقاوت اور انکارِ قرآن ہے۔ جو اعتراض صحیح بخاری اور کسی بھی صحیح حدیث پر کیا جائے گا، بعینہ وہی اعتراض قرآنِ کریم پر بھی آ جائے گا، لہٰذا امت کے اس اتفاقی فیصلے کو تسلیم کر لینے میں ہی عافیت ہے۔

اعتراض نمبر ⑤ : ''(۳) اس میں ہے کہ خود رسول اللہ ﷺ نے صلح نامہ میں لکھا تھا، حالانکہ آپ اچھی طرح نہ لکھ سکتے تھے: **هذا ما قاضى محمّد بن عبد اللّٰه لا يدخل ...** صحیح بات یہ ہے کہ آپ نے پوچھا تھا کہ رسول اللہ کہاں لکھا ہے۔ آپ کو بتایا گیا تو آپ نے اس لفظ کو قلم زد کر دیا، کیونکہ حضرت علی نے اسے قلم زد کرنے سے انکار کر دیا تھا اور پھر محمد بن عبداللہ لکھوایا۔'' («صحیح بخاری کا مطالعہ» : ۷۳/۱۔۷۴)

جواب : ① قارئین کرام! اس حدیث میں کسی لفظ کا وہ معنیٰ ومفہوم نہیں، جو میرٹھی صاحب نے بیان کیا ہے کہ ''خود رسول اللہ ﷺ نے صلح نامہ میں لکھا تھا۔''

فَكَتَبَ کا یہ معنیٰ ہرگز نہیں کہ آپ ﷺ نے خود لکھا، بلکہ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ آپ ﷺ نے لکھوایا۔ اس کا حقیقی معنیٰ اگرچہ لکھنا ہی ہے، لیکن یہاں مجازی معنیٰ لکھوانا مقصود ہے۔

اگر میرٹھی صاحب کا کوئی معتقد اس پر اعتراض کرے کہ یہاں حقیقی معنیٰ ہی مراد ہے، مجازی معنیٰ مراد لینا درست نہیں تو یہ اس کی کم علمی اور جہالت ہے، ورنہ اس سے پچھلی حدیث، جسے میرٹھی صاحب نے بھی صحیح تسلیم کیا ہے، اس میں بھی یہی مجازی معنیٰ موجود ہے۔ اس کے الفاظ ہیں:

فقال المشركون : لا تكتب محمّد رسول اللّٰه ، لو كنت رسولا لم نقاتلك .

''مشرکین نے (رسول اللہ ﷺ سے کہا)، آپ محمد رسول اللہ نہ لکھیں، کیونکہ اگر آپ

(ہمارے نزدیک) رسول ہوتے تو ہم آپ سے لڑائی نہ کرتے۔''(صحیح بخاری : ۲۶۹۸)
اب کیا منکرینِ حدیث اپنے تئیں اس صحیح پر یہ اعتراض کریں گے کہ مشرکین نبیٔ اکرم ﷺ کو کیسے لکھنے کا کہہ سکتے ہیں، حالانکہ آپ ﷺ تو پڑھنا لکھنا نہیں جانتے تھے؟
اسی حدیث کے شروع میں اگر میرٹھی صاحب غور کر لیتے تو شاید اس اعتراض سے باز رہ جاتے۔ الفاظ ملاحظہ فرمائیں: **فلما كتبوا الكتاب كتبوا ....** ''جب ان (مسلمانوں) نے عہد نامہ لکھا تو انہوں نے لکھا کہ۔۔۔''(صحیح بخاری : ۲۶۹۹)
اگر کوئی شخص اس پر یہ اعتراض کر دے کہ لکھا تو ایک آدمی نے تھا، سب نے تو نہیں لکھا تھا، لہٰذا یہ غلطی ہے تو اس کی جہالت پر کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ یہاں مراد یہ ہے کہ سب نے رضامندی سے لکھوایا تھا، لہٰذا سب کی طرف منسوب کر دیا گیا تھا۔
اسی طرح صحیح مسلم(۱۷۷۴) کی حدیث میں ہے: **أنّ نبيّ اللّٰـه صلّى الله عليه وسلّم كتب إلى كسرى وإلى قيصر وإلى النّجاشيّ وإلى كلّ جبّار يدعوهم إلى الله تعالىٰ .**
''آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دیتے ہوئے کسریٰ، قیصر، نجاشی اور ہر جابر بادشاہ کی طرف خط لکھا۔''
کیا منکرینِ حدیث اس حدیث پر یہی اعتراض کر کے مختلف بادشاہوں کو رسول اللہ ﷺ کی طرف سے دعوتِ اسلام کے لیے لکھے گئے خطوط کا بھی انکار کر دیں گے کہ آپ ﷺ تو لکھنا نہیں جانتے تھے، پھر کیسے لکھا تھا؟ حالانکہ معلوم ہے کہ یہاں لکھنے سے مراد لکھوانا ہے۔
اسی طرح قرآنِ کریم میں تیس سے زائد مقامات پر فرمانِ الٰہی ہے:
﴿ **تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ** ﴾ (البقرة : ۲۵/۲۔۸/۹۸)
''اس (جنت) کے نیچے سے نہریں چلتی ہیں۔''
اب اگر کوئی منکرِ قرآن کہہ دے کہ نہریں تو خود نہیں چلتیں، بلکہ ان کے اندر پانی چلتا ہے تو اس کا یہ اعتراض اس کی اپنی عقل کا قصور ہے۔
اسی طرح فرمانِ باری تعالیٰ ہے:
﴿ **وَاسْئَلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا وَالْعِيْرَ الَّتِيْ أَقْبَلْنَا فِيْهَا** ﴾ (يوسف : ۸۲/۱۲)

''(یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اپنے والد سے کہا) آپ اس بستی سے پوچھ لیں جس میں ہم تھے اور اس قافلے سے پوچھ لیں جس میں ہم آئے ہیں۔۔۔''

کیا کسی منکرِ قرآن کا یہ اعتراض درست ہوگا کہ:

''اس میں ہے کہ آپ اس بستی سے پوچھیں اور اس قافلے سے پوچھیں، حالانکہ پوچھا اس بستی کے باشندوں اور قافلے کے افراد سے جاسکتا ہے، خود بستی اور قافلے سے نہیں، صحیح یہ ہے کہ بستی کے باشندوں سے پوچھیں اور قافلے کے افراد سے استفسار کریں۔۔۔''؟؟؟

حالانکہ سیدھی سی بات ہے کہ یہاں حقیقی معنیٰ نہیں، بلکہ مجازی معنیٰ مراد ہے اور ہر زبان میں یہی کیفیت موجود ہے۔ بھلا جس شخص کو اتنی معمولی سی بات سمجھ نہ آئے، جو کہ ہر زبان میں روزمرہ مستعمل ہے، اسے صحیح بخاری پر اعتراض کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

② یہ الفاظ صرف عبیداللہ بن موسیٰ عبسی نے نہیں کہے، بلکہ صحیح مسلم (۱۷۸۳) میں اسحاق بن ابراہیم الحنظلی، جو کہ بالاتفاق ثقہ ومعتبر امام ہیں، نے بھی عیسیٰ بن یونس سے بیان کیے ہیں۔ لہٰذا لغتِ عرب سے اپنی جہالت کی وجہ سے ان الفاظ کو آڑ بنا کر عبیداللہ بن موسیٰ پر اعتراض کرنا نری ہٹ دھرمی ہے۔ اب منکرینِ حدیث کس کس راوی کو رافضی اور بداعتقاد کہیں گے؟

جاری ہے۔۔۔

❀❀❀❀❀❀❀

دعا

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا کیا کرتے تھے:

اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ زَوَالِ نِعْمَتِكَ ، وَتَحَوُّلِ عَافِيَتِكَ ، وَفُجَاءَةِ نَقْمَتِكَ ، وَجَمِيْعِ سَخَطِكَ .

''اے اللہ! میں تیری نعمت کے چھن جانے، تیری عافیت کے دُور ہو جانے، تیرے عذاب کے اچانک آجانے اور تیرے ہر قسم کے غصے سے تیری پناہ میں آتا ہوں۔'' (صحیح مسلم: ۲۷۳۹)

✳✳✳✳✳✳✳

اللہ کہاں ہے؟

غلام مصطفیٰ ظہیر امن پوری

اہل سنت والجماعت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اللہ رب العالمین اپنے عرش پر ہے، ہر جگہ موجود نہیں۔ اس پر قرآن وحدیث اور اجماعِ امت سے قوی اور واضح دلائل موجود ہیں۔

شیخ الاسلام ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں: **فإنّ الّذین نقلوا إجماع السّلف أو إجماع أهل السّنّة أو إجماع الصّحابة والتّابعين على أنّ اللّه فوق العرش بائن من خلقه لا يحصيهم إلّا اللّه ، وما زال علماء السّلف يثبتون المباينة ويردّون قول الجهميّة بنفيها ...** ''ان لوگوں کی تعداد اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے (وہ بے شمار ہیں)، جنہوں نے سلف یا اہل سنت یا صحابہ وتابعین کا اس بات پر اجماع نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش کے اوپر ہے، اپنی مخلوق سے جدا ہے۔ ہمیشہ سے علمائے سلف (خالق اور مخلوق کے درمیان) جدائی کا اثبات کرتے رہے ہیں اور اس کی نفی پر مبنی جہمیوں کے قول کا ردّ کرتے رہے ہیں۔''

(نقض تاسيس الجهميّة لابن تيمية : ۵۳۱/۲)

جلیل القدر صحابی سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا:

وأنزل اللّه برائتكِ من فوق سبع سماوات . ''اللہ تعالیٰ نے آپ کی برائت ساتوں آسمانوں کے اوپر سے نازل کی ہے۔'' (مسند الامام احمد : ۲۷۶/۱، ۳۴۹، الرّد على الجهمية للدارمی : ص ۵۷، المستدرك للحاكم : ۸/۴، وسندهٗ حسنٌ)

اس روایت کو امام حاکم رحمہ اللہ نے ''صحیح'' کہا ہے اور حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے ان کی موافقت کی ہے۔

ایک دوسری روایت کے الفاظ ہیں: **ونزل عذرک من السّماء .**

''آپ کی برائت آسمانوں (کے اوپر) سے اُتری ہے۔'' (صحیح بخاری : ۴۷۵۳)

اب ہم تابعینِ عظام کے اقوال ذکر کیے دیتے ہیں۔

① امام مالک بن دینار البصری رحمہ اللہ (م ۱۲۷ھ) کہا کرتے تھے:

اسمعوا إلى قول الصّادق من فوق عرشه . ''تم عرش کے اوپر سے اس

سچے (اللہ) کی بات کو سنو۔" (حلیة الاولیاء لابی نعیم الاصبھانی: ۳۵۸/۲، وسندہٗ حسنٌ)

حافظ ذہبی رحمہ اللہ (کتاب العلو للذھبی: ص ۹۷) **اور حافظ ابن القیم** رحمہ اللہ (اجتماع الجیوش الاسلامیة: ص ۲۶۸) **نے اس کی سند کو "صحیح" کہا ہے۔**

اس کا راوی سیار بن حاتم العنزی جمہور کے نزدیک "صدوق، حسن الحدیث" ہے۔

امام ابنِ حبان رحمہ اللہ **نے اسے الثقات (۲۹۸/۸) میں ذکر کیا ہے۔ امام احمد بن حنبل** رحمہ اللہ **نے اس سے روایت لی ہے، وہ ثقہ سے روایت لیتے ہیں۔**

امام ابنِ خزیمہ رحمہ اللہ (۲۵۳۲)، **امام ترمذی** رحمہ اللہ (۳۴۴۴)، **اور امام حاکم** رحمہ اللہ **نے** (۱۲۲/۱) **اس کی منفرد روایت کو "صحیح" کہا ہے۔ یہ ضمنی توثیق ہے۔**

حافظ ہیثمی رحمہ اللہ **نے اُسے ثقہ کہا ہے۔** (مجمع الزوائد: ۱۵۰/۱۰)

② **امام الضحاک بن مزاحم الہلالی تابعی** رحمہ اللہ **فرمانِ باری تعالیٰ:** ﴿ مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ ﴾ **(کوئی بھی تین آدمی سرگوشی نہیں کرتے، مگر وہ اللہ ان کا چوتھا ہوتا ہے)** (المجادلة: ۷) **کی تفسیر میں فرماتے ہیں:**

هو اللّٰه عزّ وجلّ على العرش ، وعلمه معهم . **"وہ اللہ عزوجل عرش کے اوپر ہے اور اس کا علم ان کے ساتھ ہے۔"** (الشریعة للآجری: ٦٥٥، تفسیر ابن جریر: ۱۲/۲۸۔۱۳، مسائل ابی داوٗد: ۲۶۳، الاسماء والصفات للبیھقی: ۳۴۱/۲۔۳۴۲، ح: ۹۰۹، وسندہٗ حسنٌ)

③ **سلیمان بن طرخان التیمی** رحمہ اللہ **(م ۱۴۳ھ):**

قال ابن أبي خيثمة في تاريخه : حدّثنا هارون بن معروف ، قال : حدّثنا ابن ضمرة عن صدقة عن سليمان التّيميّ ، قال : لو سألت : أين اللّٰه ؟ لقلت : في السّماء . **"صدقہ بیان کرتے ہیں کہ امام سلیمان تیمی** رحمہ اللہ **نے فرمایا، اگر آپ سوال کریں کہ اللہ کہاں ہے؟ تو میں جواب دوں گا کہ آسمانوں کے اوپر۔"**

(اجتماع الجیوش الاسلامیة لابن القیم: ٦٧، وسندہٗ حسنٌ)

④ **شریح بن عبید الحمصی کہا کرتے تھے:** **ارتفع إليك ثغاء التّسبيح ، وارتفع إليك وقار التّقديس ، سبحانك ذا الجبروت ، بيدك الملك**

"تسبیح کی آواز تیری طرف بلند ہوتی ہے اور **والملكوت والمفاتيح والمقادير ...** تقدیس کا وقار بھی تیری طرف بلند ہوتا ہے، اے طاقت والے! ہم تیرے پا کی بیان کرتے ہیں، تیرے ہی ہاتھ میں ملک اور بادشاہت ہے۔۔۔" (العظمة لابی الشیخ : ۱۰۷، وسندهٗ حسنٌ)

حافظ ذہبی رحمہ اللہ (العلو : ص ۹۳) **اور حافظ ابن القیم** رحمہ اللہ (اجتماع الجیوش الاسلامیة : ص ۲۶۹) نے اس کی سند کو "صحیح" کہا ہے۔

④ **ربیعہ بن عبدالرحمٰن تابعی** رحمہ اللہ **(م ۱۳۶ھ):**

امام سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں ربیعہ بن عبدالرحمٰن کے پاس تھا۔ آپ رحمہ اللہ سے ایک آدمی نے پوچھا کہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ﴾ (طٰہٰ : ۵)، رحمٰن عرش پر کیسے مستوی ہے؟ تو آپ نے فرمایا: **الإستواء غير مجهول ، والكيف غير المعقول ، ومن الله الرّسالة ، وعلى الرّسول البلاغ ، وعلينا التّصديق .**

"استواء معلوم ہے، اس کی کیفیت عقل میں آنے والی نہیں۔ یہ پیغام اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، رسول ﷺ پر پہنچانا لازم تھا اور ہم پر تصدیق کرنا ضروری ہے۔"

(العلو للذهبی : ص ۹۸، وسندهٗ صحیحٌ)

⑤ **امام ایوب بن ابی تمیمہ سختیانی** رحمہ اللہ **(م ۱۳۱ھ) نے معتزلہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:**

إنّما مدار القوم على أن يقولوا : ليس في السّماء شيء .

"ان لوگوں کا نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ وہ کہہ دیں کہ آسمانوں کے اوپر کوئی چیز نہیں۔"

(العلو للذهبی : ص ۹۸، وسندهٗ حسنٌ)

حافظ ذہبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: **هذا إسناد كالشّمس وضوحا ، والاسطوانة ثبوتا عن سيّد أهل البصرة وعالمهم .** "یہ سند وضاحت میں سورج کی طرح اور پختگی میں ستون کی طرح ہے، جو کہ اہل بصرہ کے سردار اور ان کے عالم (امام ایوب سختیانی رحمہ اللہ) سے مروی ہے۔" (العلو للذهبی : ص ۹۸)

❀ ❀ ❀ ❀ ❀ ❀ ❀

اہل سنت کون؟

حافظ ابو یحییٰ نور پوری

امام محمد بن عبد الوہاب رحمہ اللہ سلف صالحین کا عقیدہ بیان کرتے ہوئے اور اسے اپنا عقیدہ قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

''۔۔۔جہاد اس وقت سے جاری ہے، جب سے اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا ہے اور اس امت کے آخری شخص کے دجال سے لڑائی کرنے تک جاری رہے گا۔ اسے کسی ظالم کا ظلم اور کسی عادل کا عدل نہیں روک سکتا۔ میں مسلمان ائمہ، نیک ہوں یا بد، ان کی سمع وطاعت کو واجب سمجھتا ہوں، جب تک وہ اللہ تعالیٰ کی کسی نافرمانی کا حکم نہ دیں۔

جو شخص خلافت کا والی بن جائے اور لوگ اس پر جمع ہو جائیں اور اس پر راضی ہو جائیں یا وہ ان پر تلوار کے زور پر غالب آ جائے، حتیٰ کہ خلیفہ بن جائے، اس کی اطاعت واجب ہو جاتی ہے اور اس کے خلاف بغاوت حرام ہو جاتی ہے۔

میں اہل بدعت سے قطع تعلقی اور بائیکاٹ ضروری سمجھتا، یہاں تک کہ وہ توبہ کر لیں اور میں ان کے ظاہر پر حکم لگاتا ہوں اور ان کے باطن کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتا ہوں۔

میرا اعتقاد ہے کہ ہر بدعت گمراہی ہے۔ نیز میرا عقیدہ ہے کہ ایمان زبان کے قول، اعضاء کے عمل اور دل کے اعتقاد کا نام ہے۔ یہ اللہ کی اطاعت سے بڑھتا اور اس کی نافرمانی سے کم ہوتا ہے۔ اس کے ستر سے کچھ اوپر شعبے ہیں، جن میں سے سب سے اعلیٰ شعبہ توحید کی گواہی اور سب سے ادنیٰ شعبہ راستے سے تکلیف دہ چیز کو ہٹانا ہے۔

میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو واجب سمجھتا ہوں، جیسا کہ واضح شریعتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام اسے واجب قرار دیتی ہے۔

یہ مختصر عقیدہ ہے، جسے میں نے مصروفیت کے باوجود لکھا ہے، تاکہ آپ کو میرے اعتقاد کا علم ہو جائے۔ میں جو کہہ رہا ہوں، اللہ تعالیٰ اس پر گواہ ہے۔''

(مؤلفات ابن محمد بن عبد الوهاب : ١١)